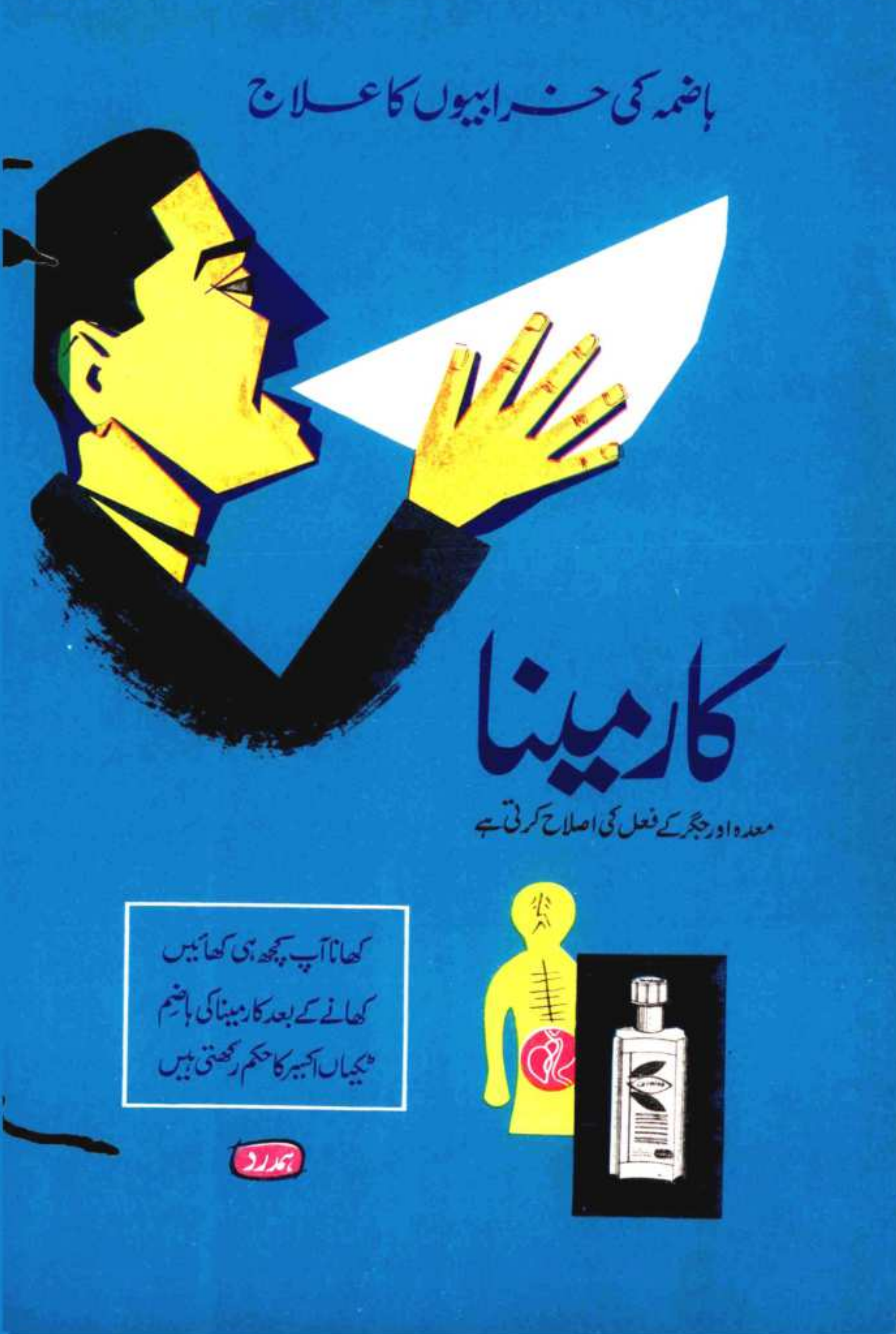
ہمدرد

نونہال





ہاضمہ کی خرابیوں کا علاج
کارمینا
معدہ اور جگر کے فعل کی اصلاح کرتی ہے
کھانا آپ کچھ ہی کھائیں
کھانے کے بعد کارمینا کی ہاضم
ٹکیاں اکسیر کا حکم رکھتی ہیں
ہمدرد

جون ۱۹۶۵ء

مدیر اعلا: حکیم محمد سعید

مدیر معاون: مسعود احمد برکاتی

فون: ۴۷۷۷۵

شمارہ ۶ جلد ۱۲

دفتر ہمدرد نونہال
ہمدرد ڈاک خانہ، کراچی ۱۸

ہمدرد نونہال

جاگو، جگاؤ

اخلاق و کردار کو دُوسروں سے محبت کر کے بہتر بنایا جاسکتا ہے۔
ہمیں چاہیے کہ ہم دُوسروں کے احساسات و جذبات کا خاص
خیال رکھیں اور کسی وقت منھ سے ایسی کوئی بات نہ نکالیں،
جس سے دُوسروں کا دل دُکھے۔

حکیم محمد سعید



قیمت: — ایک رسالہ: ۷۵ پیسے — سالانہ: آٹھ رُوپے



گھر کا گھر خفا

محشر بدایونی

جانے آج یہ قصہ کیا ہے
کیوں مجھ سے ہر ایک خفا ہے

میری ننھی گڑیا رانی
تھی جو مری چھاؤں پہ دیوانی
لیٹی ہے منہ اپنا پھیرے
آئے گی جیسے پاس نہ میرے
کوئی تو جی میں رنج بھرا ہے
کیوں آنکھوں پر ہاتھ دھرا ہے
کتنی بری یہ بات ہے اس کی
میری طرف کو لات ہے اس کی



جانے آج یہ قصہ کیا ہے
کیوں مجھ سے ہر ایک خفا ہے

گھر کا گھر خفا




مجھ کو دیکھ کے بلّی بھاگے
بلّی پیچھے مُرغی آگے
جا بیٹھا کابک میں کبوتر
مُرغا نکلا گھر سے باہر
گھور رہا ہے بھیڑ کا بچّہ
جیسے مجھے کھالے گا کچّا
طوطا غصّے میں چلّائے
گائے بگڑ کے سینگ دکھائے




جانے آج یہ قصّہ کیا ہے
کیوں مجھ سے ہر ایک خفا ہے




چوں چوں کرتی چڑیاں آئیں
میں سمجھی کچھ تحفہ لائیں
کوئی تو بیٹھی طاق میں جاکر
کوئی الماری کے اوپر
دو کمرے میں دس آنگن میں
باقی پانی کے برتن میں
میں جو بڑھی تو باری باری
اڑ گئیں پھُر سے چڑیاں ساری

جانے آج یہ قصّہ کیا ہے
کیوں مجھ سے ہر ایک خفا ہے



چیتے اور شیرنی کی شادی



افریقہ کے جنگلوں میں شیر اور چیتے کی دوستی کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔ دونوں کو ایک پنجرے میں رکھا جائے تو بھی اس کا امکان کم ہی ہوتا ہے، لیکن جاپان میں ایک چیتے اور شیرنی کی شادی کامیاب ثابت ہوئی ہے۔

جاپان میں شادیاں کرانا اور رشتے طے کرنا تقریباً قومی مشغلہ ہے۔ اوساکا شہر کے کوشین ہانشن پارک چڑیا گھر کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ڈوئی کو خیال آیا کہ چیتے اور شیرنی کی شادی کرائی جائے تو اُن کے بچّے کیسے ہوں گے۔ انھوں نے یہ تجربہ کرنے کا تہیّہ کرلیا۔ اُنھیں علم تھا کہ اکثر ان دونوں درندوں کے ملاپ سے بچّے ہوتے ہیں، مگر وہ زیادہ عرصے زندہ نہیں رہتے اور اگر زندہ رہتے ہیں تو اُن کے اولاد نہیں ہوتی، لیکن ان کا خیال تھا کہ یہ تجربہ سائنٹیفک بنیاد پر کیا جائے تو اس کے نتیجے میں ایک نئی قسم کا درندہ پیدا کیا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر ڈوئی نے اعلا نسل کا ایک چیتا اور ایک شیرنی تلاش کی۔ چیتا جس کا نام کانیو ہے، بڑا ہی تندخو اور بدمزاج معلوم ہوتا تھا۔ شیرنی بھی جسے سونو کہتے ہیں، انتہائی خونخوار نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر ڈوئی نے انھیں ایک ہی پنجرے میں رکھا۔

تین برس تک اس چیتے اور شیرنی نے سب کو دھوکے میں مبتلا رکھا۔ بظاہر دونوں ایک دوسرے کے ساتھ سرد مہری سے پیش آتے تھے اور چڑیا گھر کے اسٹاف کی موجودگی میں ایک دوسرے کو نظر انداز کرتے تھے۔ آخر ایک دن ایسا آیا جب شیرنی نے دُو بچے دیے جنھیں "چیشے" کہنا ہی مناسب ہوگا۔ ان کے جسم کی شکل اور خطوط اپنی ماں شیرنی کے سے تھے، لیکن پورے جسم پر ان کے باپ چیتے کی طرح کالی چتیاں پڑی ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر ڈوئی نے ایک ماہ تک ان بچوں کی پیدائش کو خفیہ رکھا، کیوں کہ وہ یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ وہ زندہ بھی رہتے ہیں یا نہیں۔

دونوں بچے تیزی کے ساتھ بڑھتے رہے۔ اُن کے باپ چیتے سے اُنھیں فوراً ہی نہیں ملایا گیا، بلکہ کچھ عرصے تک بچوں اور اُن کے باپ کے درمیان باریک تاروں کی جالی کا پردہ رکھا گیا۔ بچوں کے نام رکھنے کا ایک مقابلہ ہوا، جس میں سولہ ہزار افراد نے حصّہ لیا۔ نر چیشے کا نام یوکیچی رکھا گیا اور اس کی بہن کا نام یونکور رکھا گیا۔ یہ خاندان بڑی خوش خرم زندگی بسر کر رہا ہے اور اب اس میں تین ننھے چیشوں کا اضافہ ہو چکا ہے۔



اور وہ گھوڑا بھی لے گیا!

محمد حسین حسان - نئی دہلی

کہتے ہیں اب سے بہت دنوں پہلے ایک گاؤں میں ایک زمیندار رہتا تھا۔ یہ بڑا بخیل، بہت کنجوس تھا، اس کی ایک بیوی تھی اور یہ اتنی ہی بھولی بھالی ناسمجھ اور بے وقوف تھی۔

اسی گاؤں میں ایک اور آدمی رہتا تھا۔ بہت چالاک، بڑا جعل ساز اور چلتا پرزہ۔ اس نے سوچا کسی طرح اس کنجوس کی دولت پہ ہاتھ صاف کرنا چاہیے۔ اور صاحب، اس نے کنجوس کے پڑوسیوں سے اس کے گھر، اس کے کنبے کے بارے میں ذرا ذرا سی باتیں بھی معلوم کرلیں۔ یہ بھی معلوم کرلیا کہ اس کے کتنے رشتہ دار زندہ ہیں کتنے مرگئے اور ان کے نام کیا کیا ہیں۔

ایک دن کنجوس اپنے کسی کام سے پڑوس کے گاؤں میں گیا ہوا تھا۔ جعل ساز نے یہ موقع غنیمت جانا جھٹ مسافر کا بہروپ بھرا اور کنجوس کے گھر کی طرف چل پڑا۔ لنگڑا لنگڑا کر چل رہا تھا۔ جیسے بہت دُور کے سفر نے اُسے تھکن سے چُور کر دیا ہو۔

اے لیجیے، کنجوس کے دروازے

کی سیڑھیوں پر پہنچتے ہی وہ دھم سے گر پڑا اور بہت ہی تھکی ہوئی کم زور آواز میں کنجوس کا نام لے کر پکارنے لگا۔

کنجوس کی بیوی دوڑی دوڑی دروازے پر آئی۔ بہروپیا اس وقت بُری طرح ہانپ رہا تھا۔ عورت کو دیکھ کر کانپتی ہوئی آواز میں بولا، "کیوں ماں کیا مالک گھر میں ہیں؟"

کنجوس کی بیوی سادگی سے بولی، "نہیں تو وہ تو کسی کام سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ تمھیں ان سے کیا کام ہے؟"

بہروپیے نے جواب دیا، میں سندر بن کے گھنے جنگل سے آرہا ہوں مجھے یہاں تک ایک بوڑھے جوڑے نے بھیجا ہے۔ یہ میاں بیوی اس دنیا سے منھ موڑنے کے بعد سندربن چلے گئے ہیں۔ یہیں انھوں نے اپنا گھر بنا لیا ہے۔ ان میں ایک تو تمھارے سسر ہیں، ایک تمھاری ساس ہیں۔"

وہ بہت رک رک کر بول رہا تھا۔ مارے تھکن کے منھ سے بات نہیں نکل رہی تھی۔

کنجوس کی بیوی حیرت سے چیخ کر بولی، "باپ رے باپ تم وہاں سے آرہے ہو۔ جبھی اتنے تھکے ہوئے ہو۔ اس قدر ہانپ رہے ہو کہ منھ سے بات نہیں نکل رہی ہے۔"

اسے بہروپیے کی بات پر پکّا یقین تھا۔ وہ بہت ہی رحم دلی اور ہمدردی کے لہجے میں بولی، "آؤ آؤ، اندر آجاؤ بھیا۔ یہاں آکر آرام کرو۔"

اس نے بہروپیے کو بیٹھنے کو جگہ دی۔ پینے کو پانی لائی۔ طرح طرح کی مٹھائیاں سامنے لاکر رکھیں اور پھر اس سے پوچھنے لگی، "کیوں بھائی میرے ساس سسر وہاں کس حال میں رہتے سہتے ہیں۔"

بہروپیے نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور بولا، کاش ان کے بارے میں کوئی بُری خبر سنانے کا کام میرے ذمّے نہ ہوتا۔ وہ بے چارے فاقوں پر فاقے کر رہے ہیں۔ مارے سردی کے دم لبوں پر ہے۔ بے چاروں کو کپڑے کی ایک دھجّی بھی نصیب نہیں۔

نہ جانے کب سے اس طرح ننگے بھوکے زندگی کے دن تیر کر رہے ہیں۔ اسی تنگی اور پریشانی سے عاجز آکر تو انھوں نے مجھ سے کہا کہ بھائی، میرا لڑکا اور بہو مشرقی پاکستان کے ایک گاؤں میں رہتے ہیں۔ وہ بہت مالدار ہیں۔ تم ذرا اُن کے پاس چلے جاؤ۔ انھیں ہماری پریشانی سنا دینا اور ہمارے کھانے کپڑے کے لیے جو رُپیہ دیں وہ ہمیں پہنچا دینا۔ بس اسی لیے اتنی دور کا سفر کر کے میں یہاں پہنچا ہوں۔"

یہ داستان سنتے ہی کنجوس کی بیوی بے قرار ہوگئی اور بولی، "ہائے ہائے ہم یہاں اتنے آرام سے ہیں اور ہمارے ساس سسر نہ جانے کب سے مصیبت اٹھا رہے ہیں۔"

وہ فوراً اندر کوٹھے میں گئی اپنے اور کنجوس کے سارے کپڑے اٹھا لائی اور بہروپیے کے آگے ڈھیر کر دیے۔ اسی پر بس نہ کی اپنے سارے زیور اور کنجوس کے رُپیوں کا صندوقچہ بھی اس کے حوالے کر دیا اور بولی،

"میرے خاوند کی ساری پونجی اسی صندوقچہ میں ہے، اسے لے جاؤ اور ہمارے بزرگوں کے کھانے پہننے کا انتظام کرو۔"

بہروپیا خاص انداز میں بولا، "ماں، تمھارے پاس سچ مچ سونے کا دل ہے۔ تمھاری جیسی لائق بہو آج دنیا کے پردے پر نہ ملے گی۔"

اور اس نے جلدی جلدی سارا سامان سمیٹ سماٹ ایک بڑا لمبا سا بنڈل بنایا۔ اُسے اپنے سر پر رکھا عورت سے اجازت لی اور دل ہی دل میں ہنستا ہوا نو دو گیارہ ہوا۔

تھوڑی دیر بعد کنجوس بھی گھر آپہنچا، اس کی بیوی نے کہا، سنتے ہو والد، والدہ کے پاس سے ایک آدمی آج ایک پیام لے کر آیا تھا۔ وہ لوگ اب سندر بن میں رہتے ہیں۔ بڑے پریشان ہیں اور پھر رُپیوں اور کپڑوں وغیرہ کی سب بات بتائی۔

کنجوس نے اپنا سر پیٹ لیا۔ سمجھ گیا کہ اس بے عقل کو کسی نے جل دیا ہے۔ پر اب ایک منٹ ضائع

کرنے کا موقع نہ تھا، فوراً گھوڑے پر زین کسا اور جس طرف یہ بہروپیا روانہ ہوا تھا، اسی طرف گھوڑا ڈال دیا۔ کوئی ایک میل جاکر یہ بدمعاش نظر آیا۔ لوٹ کا سارا مال سر پہ اٹھائے چلا جارہا تھا۔ کنجوس نے بڑے زور سے للکارا، "ٹھہر جا او اچکّے، خبردار جو آگے قدم بڑھایا۔ تو میری بیوی کو بے وقوف بنا سکتا ہے۔ مجھے نہیں بنا سکتا خیریت اسی میں ہے کہ تمام کپڑے اور سارے رُپے فوراً مجھے لوٹا دے!"

بہروپیے نے ذرا کے ذرا پیچھے مڑکر دیکھا اور فوراً بھاگ پڑا اور دیکھتے دیکھتے ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ کنجوس نے بھی گھوڑے کو ایڑ لگائی اور تھوڑی دیر میں اسے جا لیا۔ بہروپیے کو اس وقت اور تو کچھ نہ سوجھا، سامنے ایک درخت تھا اُسی پہ چڑھ گیا۔

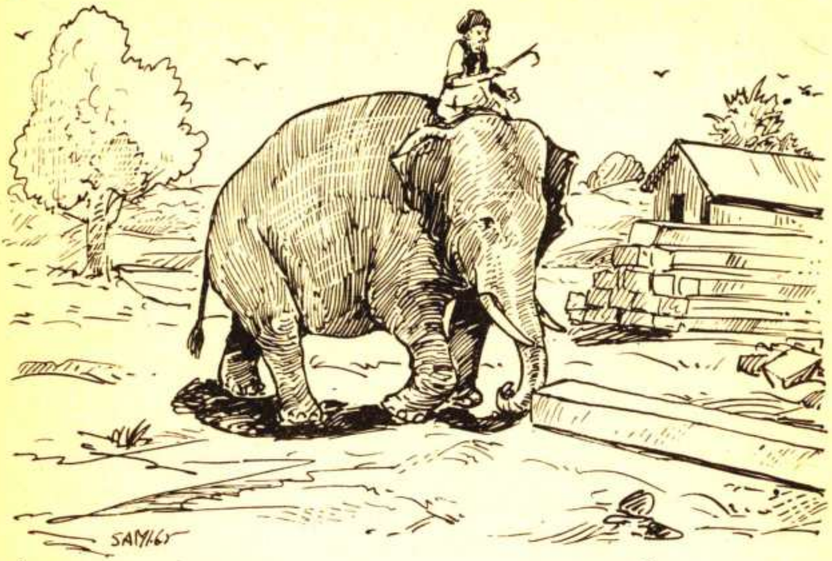
کنجوس غصّہ سے گرج کر بولا، "ابے او چوٹّے نیچے اُترتا ہے یا نہیں؟"

بہروپیے نے بڑے اطمینان سے جواب دیا، "جی نہیں، بالکل نہیں۔"

کنجوس پھر چیخا، "اچھی بات ہے، تو نہیں اُترتا تو میں ایک منٹ میں خود تجھ تک پہنچتا ہوں۔"

اس نے گھوڑے کو درخت سے باندھا اور دھیرے دھیرے اوپر چڑھنے لگا۔ خوب موٹا تازہ تھا۔ تھوڑی دیر میں ہانپنے لگا اور پسینے میں شرابور ہوگیا۔ بہروپیا بڑے اطمینان سے درخت پہ بیٹھا اس کا انتظار کرتا رہا۔ جوں ہی کنجوس اس کے قریب پہنچا، وہ مال سمیت فوراً نیچے اتر آیا۔ گھوڑا موجود ہی تھا، اس پہ سوار ہو یہ جا وہ جا۔ کنجوس بے چارہ نا اُمیدی اور بے بسی کے عالم میں دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔

اور جب کافی دیر کے بعد کنجوس گھر پہنچا تو تھکن، مایوسی اور نا امیدی سے اس کی حالت قابل رحم تھی، مگر اس کی بیوی اسے دیکھتے ہی مسکرا پڑی اور بولی، "اے ہے کتنی دُور سے آرہے، مجھے یقین تھا کہ تم اس غریب کو اپنا گ ضرور دے دوگے، تاکہ وہ رُپیہ اور کپڑے لے کر جلد سے سندر بن پہنچ جائے۔ سچ مچ تم کیسے دل والے اچھے انسان ہو۔ اپنے ماں باپ کے لیے دل سے دعا نکلتی ہے، جنھوں نے تم جیسے سخی سے میرا رشتہ جوڑا، تمھیں میرا خاوند بنایا۔



خشکی کا سب سے بڑا جانور

علی ناصر زیدی

خشکی کا سب سے بڑا جانور ہاتھی ہے۔ بعض لوگ شیر کو نہیں، بلکہ اُسے جنگل کا بادشاہ کہتے ہیں۔ افریقی نر ہاتھی کا قد گیارہ فیٹ تک اور وزن سات ٹن یا چودہ سو پونڈ تک پہنچ جاتا ہے۔ کانوں کی لمبائی ساڑھے تین فیٹ اور چوڑائی ڈھائی فیٹ تک ہوتی ہے۔ اس کے دانت گیارہ فیٹ تک باہر نکل آتے ہیں اور اُن کا گھیرا اٹھارہ انچ ہوتا ہے۔ دونوں دانتوں کا وزن ڈھائی سو پونڈ تک ہوتا ہے۔ پیدائش کے وقت ہاتھی کے بچے کا قد تین فیٹ اور وزن تقریباً دو سو پونڈ ہوتا ہے۔

ہاتھی کے جسم کا سب سے عجیب حصہ اُس کی سونڈ ہے، جو قدرت نے کسی اور جانور کو عطا نہیں کی۔ اُسے کسی بھی سمت میں مروڑا جاسکتا ہے، پھر بھی اس کی قوت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ ہاتھی کی سونڈ میں کہیں کوئی ہڈی نہیں ہوتی، لیکن رگ پٹھے اتنے سخت اور مضبوط ہوتے ہیں کہ تیز سے تیز چھری بھی انھیں مشکل سے کاٹ سکتی ہے۔ ہاتھی اپنی سونڈ سے بھاری وزن اٹھانے کے علاوہ گھاس کی ایک پتی بھی آسانی سے چن سکتا ہے۔ اس کی مدد سے وہ بھاری بھرکم درخت کو بھی جڑ سے اکھاڑ کر اپنے چاروں طرف گھما سکتا ہے۔ سونڈ ہی ہاتھی کی ناک بھی ہوتی ہے۔ اُس کی سونگھنے کی قوت بڑی تیز ہوتی ہے۔

ہاتھی اتنا موٹا تازہ جانور ہونے کے باوجود آسانی سے بیٹھ سکتا ہے، لیکن وہ بہت کم ایسا کرتا ہے۔ افریقہ میں ہزاروں ہاتھی کھڑے کھڑے سوتے دیکھے گئے ہیں۔ کسی شکاری کو ان کے آس پاس زمین پر کوئی ایسا نشان بھی نہیں ملا، جس سے پتہ چلے کہ وہ بیٹھے تھے۔ پالتو ہاتھی کو البتہ آسانی سے بٹھایا جاسکتا ہے۔ مہاوت اسے اتنا سدھا لیتا ہے کہ وہ اُس کے اشاروں پر چلتا ہے۔ جب آدمیوں کو سوار کرانا ہوتا ہے تو مہاوت ہاتھی کو اشارہ کرتا ہے اور وہ نیچے بیٹھ جاتا ہے۔ جب سب آدمی بیٹھ جاتے ہیں تو وہ آسانی سے کھڑا ہو جاتا ہے۔

مشہور بات ہے کہ ہاتھی کے لگام نہیں ہوتی۔ کہا جاتا ہے کہ شاہ نادر شاہ نے اسی لیے اس کی سواری پسند نہیں کی تھی۔ وہ ہاتھی پر بیٹھا اور کہا، "اس کی لگام میرے ہاتھوں میں دو۔" لیکن لگام ہوتی تو دی جاتی۔ نادر شاہ یہ کہہ نیچے اُتر آیا کہ "جس سواری کی لگام ہمارے ہاتھ میں نہیں، ہم اُس پر نہیں بیٹھیں گے۔"

مہاوت ہاتھی کو قابو میں رکھنے کے لیے لگام کی بجائے لوہے کا آنکس استعمال کرتا ہے۔ وہ بار بار یہ کانٹے دار چابک اُس کے سر پر

مارتا ہے۔ جب ہاتھی کو تکلیف ہوتی ہے تو وہ مہاوت کا حکم مانتا ہے۔ اس کے باوجود بعض ہاتھی بے قابو ہوجاتا ہے۔ مست ہاتھی کا غصّہ مشہور ہے۔ وہ مہاوت کیا کسی کی بھی پرواہ نہیں کرتا۔ ایسے واقعات سننے میں آئے ہیں کہ ہاتھی نے غصّے کے عالم میں اپنے مہاوت کو مار ڈالا۔

ہاتھی کی مونچھیں بڑی سخت ہوتی ہیں۔ سرکس والے انھیں صاف کرنے کے لیے ایک طرح کی ٹارچ استعمال کرتے ہیں، جس سے وہ جل جاتی ہیں۔ سرکس والے ہاتھیوں کو بڑی اچھی طرح سدھا لیتے ہیں اور پھر ان سے طرح طرح کے تماشے کراتے ہیں۔

اتنے بھدّے جسم کے باوجود ہاتھی بڑا ہی سمجھ دار اور ذہین جانور ہوتا ہے۔ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ پالتو جانوروں میں کتّے کے بعد ذہانت میں کوئی دوسرا جانور ہاتھی کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ بھارت، پاکستان اور مشرقِ بعید میں ہاتھی کو مدّت سے بوجھ اٹھانے کے لیے کام میں لایا جارہا ہے، پھر بھی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ صحیح معنوں میں پالتو جانور ہے۔ آزادی ختم ہوجانے اور قید ہوجانے کے بعد ہاتھی بچّے نہیں دیتا، جس سے ظاہر ہے کہ وہ پالتو بننا پسند نہیں کرتا، اسے اپنی آزادی بہت زیادہ عزیز ہے۔

جنگلی ہاتھی مل جل کر جھنڈوں کی شکل میں رہتے ہیں۔ ان میں آپس میں بڑا اتفاق ہوتا ہے۔ جب کسی جھنڈ پر حملہ ہوتا ہے تو اس کے ہاتھی مضبوط حلقہ بنا کر بچّوں، بیمار اور بوڑھے ہاتھیوں کو اندر لے لیتے ہیں اور اُن کی حفاظت کرتے ہیں۔ اگر اُن کا کوئی ساتھی زخمی ہوجاتا ہے تو وہ اُسے اٹھا کر کسی محفوظ جگہ پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔

ان خوبیوں کے ساتھ ساتھ ہاتھی میں ایک خامی بھی ہے۔ جب اُسے غصّہ آتا ہے تو وہ بے حد خطرناک ہوجاتا ہے۔ مست ہاتھی کسی چیز

سے نہیں ڈرتا۔ ایک مرتبہ برما میں ایک جنگلی ہاتھی نے اپنے جنگل سے ایک ریلوے انجن گزرتے دیکھ لیا اور یہ سمجھا کہ یہ کالا کلوٹا بے ڈھنگا جانور بغیر اجازت اُس کے علاقے میں شور مچاتا بھاگا جا رہا ہے۔ بس پھر کیا تھا ہاتھی نے انجن کا مقابلہ کیا اور سامنے سے ایسی ٹکّر ماری کہ خود ڈھیر ہو گیا۔ انجن کا وزن پچاس ٹن سے زیادہ تھا، پھر بھی وہ لائن سے اُتر کر ایک طرف گر گیا۔

غصّے کے علاوہ ہاتھی کی دشمنی بھی مشہور ہے۔ ایسے واقعات سننے میں آئے ہیں کہ اگر اُسے کسی انسان سے دشمنی ہو گئی اور وہ بے چارہ اپنی جان بچانے کے لیے کسی درخت پر چڑھ گیا تو ہاتھی نے ٹکّر مار مار کر اس درخت کو ہی گرا دیا۔

سب سے بڑا پرندہ



امریکا میں کیلی فورنیا کا گدھ دُنیا کا سب سے بڑا پرندہ ہے۔ اس کے پروں کا پھیلاؤ دس فیٹ تک ہوتا ہے۔ یہ گدھ اب نایاب ہوتے جا رہے ہیں اور صرف کیلی فورنیا میں "سرا" نام کے پہاڑ کی چوٹیوں پر پائے جاتے ہیں۔ کسی زمانے میں یہ گدھ امریکا کے جنوبی علاقوں کی چٹانوں اور پتھریلے علاقوں میں بکثرت ہوتے تھے، لیکن اندھا دھند شکار کی وجہ سے ان کی تعداد بھی بہت کم رہ گئی اور ایک پہاڑ کے علاوہ اور جگھوں پر ان کا نام و نشان تک مٹ گیا۔ یہ گدھ جسے کینڈر کہا جاتا ہے، جوڑا بن کر رہتا ہے اور مادہ گدھ دو سال بعد صرف ایک انڈا دیتی ہے اور یوں دو سال بعد خاندان میں ایک گدھ کا اضافہ ہوتا ہے۔ امریکا کی پُرانی کہانیوں میں اس گدھ کو "گرج دار پرندہ" کہا گیا ہے۔



ضیاء مفتی

بَیل نے گھوڑ دَوڑ جیت لی

تقریباً چالیس برس پیشتر برازیل کے نزدیک ریس کورس کے منتظمین نے ایک دَوڑ کے مقابلے کا اشتہار شائع کیا۔ یہ ایک میل کی دَوڑ تھی، جو ایک خاص دن منعقد ہونا تھی۔ اس کے لیے ایک سو ڈالر کا انعام رکھا گیا۔ مقابلے کی شرائط کے مطابق اس دَوڑ میں ہر وہ جانور حصّہ لے سکتا تھا، جس کی چار ٹانگیں اور جسم پر بال ہوں۔

ٹام نامی ایک شخص کے پاس ایک بیل تھا، جس پر سوار ہو کر وہ اناج کی بوری چکّی پر لے جایا کرتا تھا۔ اس نے جب اشتہار پڑھا تو اپنے بیل کو اس مقابلے میں شریک کرنے کا ارادہ کر لیا، لیکن اس کے متعلق کسی سے بھی کوئی بات نہ کی۔ اس نے مشق کے طور پر چاندنی راتوں میں ریس کے رستے پر کئی مرتبہ سواری کی۔ بیل اِس رستے پر بڑا اچھا چلتا۔ ٹام اس مہمیز کے ساتھ سواری کرتا، جنھیں بیل خصوصاً ناگوار سمجھتا۔ جب مہمیز اس کی اطراف میں استعمال کیے جاتے تو وہ اُچھل پڑتا اور بڑی زور سے چیختا۔

مقابلے کی صبح ٹام، بیل کی پیٹھ پر سوار ہو کر گراؤنڈ میں آیا۔ زین کے بجائے اس کے پاس بیل کی ایک سوکھی ہوئی کھال تھی، جس کا اگلا حصّہ ابھی تک سینگوں سمیت اُبھرا ہوا تھا۔ اس حصّے کو اُس نے پیٹھ کی جانب رکھا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا ٹین کا سینگ پکڑ رکھا تھا۔

ججوں کے اسٹینڈ تک ٹام سوار ہو کر گیا اور اپنا بیل مقابلے میں شریک کرنے کی درخواست کی۔ گھوڑوں کے مالکوں نے اس پر اعتراض کیا۔ ٹام نے اشتہار کی دفعات دیکھنے کی اپیل کی۔ اس نے اصرار کیا کہ چوں کہ اس کے بیل کی چار ٹانگیں اور جسم پر بال ہیں، اس لیے وہ اسے شریک کرنے میں حق بجانب ہے۔ کافی بحث و تمحیص کے بعد ججوں نے اعلان کیا کہ وہ یہ فیصلہ صادر

کرنے پر مجبور ہیں کہ بیل کو دوڑنے کا حق حاصل ہے۔ چناں چہ اسے بھی شریکِ مقابلہ کرلیا گیا۔

دَوڑ شروع ہونے کے وقت بیل اور تمام گھوڑے اپنی جگھوں پر تیار کھڑے ہوگئے۔ گھوڑ سوار ہنس رہے تھے کہ انھیں خواہ مخواہ بیل کے ساتھ دَوڑ لگانے کی زحمت دی گئی۔ انھوں نے سوچا کہ جُوں ہی گھوڑے دَوڑے یہ بھانڈ نقل ختم ہوجائے گی۔

اشارہ دیا گیا اور مقابلہ شروع ہوگیا۔ ٹام نے ٹین کے سینگ کے ساتھ بیل کو چھوڑا، جب مہمیز اس کی اطراف میں لگائے تو بَیل زور سے اُچھلا اور بڑی ہی خوفناک آواز کے ساتھ چلایا۔ غاں، اُوں، ایں، اُوں......

اس کی رفتار معمولی ہونے کے باوجود اس پر پڑی ہوئی سوکھی کھال اوپر نیچے ہوکر پھڑ پھڑانے لگی۔ پھٹ پھٹ پھٹا پھٹ، پھٹ پھٹ پھٹا پھٹ۔ بیل جب بھی کُودتا، تو گڑ گڑاہٹ اور شور کی مِلی جُلی آوازیں پیدا ہوتیں، جو اس سے قبل ریس کورس پر کبھی نہ سُنی گئی تھیں۔ تمام گھوڑے پگڈنڈی سے اُتر گئے۔ ہر ایک ایسا دکھائی دے رہا تھا، جیسے وہ اس ناگہانی مصیبت سے چھٹکارا پانے کے لیے وہاں سے کسی اور طرف بھاگ نکلنے کا ارادہ کیے ہوئے ہے۔ گھوڑ سواروں کی ہزار کوششوں کے باوجود کوئی بھی گھوڑا وقت پر واپس نہ لایا جاسکا کہ وقت کی کمی پوری کی جاتی۔ بیل نے دَوڑ پوری

کرلی اور انعام کی تھیلی ٹام کے حوالے کردی گئی۔

گھوڑ سواروں نے اس پر بڑا ہنگامہ برپا کیا، لیکن اس تماشے کی دل لگی نے مجمع کو بیل کی حمایت پر مجبور کردیا۔ گھوڑ سواروں نے چیخ وپکار کی کہ اُنھیں فریب دے کر لُوٹا گیا ہے اور یہ سب کچھ صرف ٹام کے سینگ اور بیل کی کھال کی وجہ سے ہوا۔ اگر ان چیزوں کی اُسے گراؤنڈ میں لانے کی اجازت نہ دی جاتی تو نتیجہ برعکس ہوتا۔ اس پر ٹام نے اُنھیں بتایا کہ اس کا بیل اب بھی اُن کے گھوڑوں کو ہرا سکتا ہے اور اگر وہ اُسی سو ڈالر کے عیوض جو کہ اس نے جیتا ہے شرط لگائیں تو وہ بَیل کی سُوکھی کھال اُتار دے گا اور ٹین کا سینگ بھی چھوڑ کر ایک صاف دَوڑ ان کے ساتھ لگائے گا۔ اس کی پیشکش قبول کرلی گئی اور وہ رقم شرط پر لگادی گئی۔ وہ سب دوبارہ اپنی جگھوں پر کھڑے ہوگئے اور اشارہ دے دیا گیا۔ ٹام نے بیل کو مہمیز کے ساتھ چھوڑا۔ بیل عادت کے مطابق اُچھلا اور پھر ایک خوفناک آواز لگائی غاں اوں ایں اُوں۔ گھوڑوں کو یہ دہشتناک آواز اچھی طرح یاد تھی۔ اس خدشے کے تحت کہ اس آواز کے بعد پھر وہی حشر کا سماں برپا ہونے والا ہے، وہ صحیح رستے سے اُتر گئے۔ گھوڑ سواروں نے بڑا دَم مارا، لیکن گھوڑوں پر قابو نہ پاسکے۔ مجمع کا مارے ہنسی کے بُرا حال ہوگیا اور ٹام کو دَوڑ جیتنے پر انعام کا دوبارہ حق دار قرار دے دیا گیا۔

بیگم ریچھ کا وزن چھے آدمیوں کے برابر ہوتا ہے اور ہر سال
جنوری کے مہینے میں اُن کے ہاں دو گول مٹول جڑواں بچّے ہوتے ہیں

سفید برفانی ریچھ

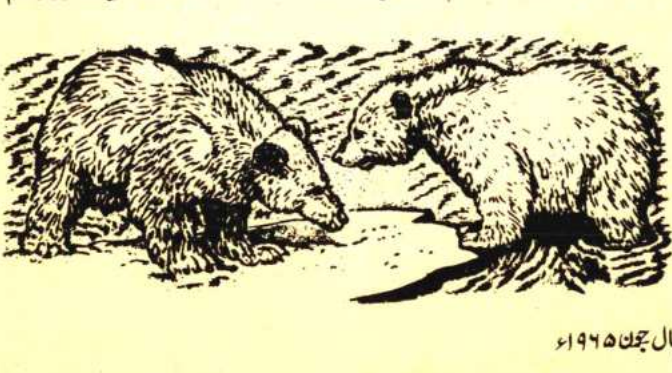
یہاں سے دُور، بہت دُور شمال میں قطب شمالی کا وہ علاقہ ہے، جہاں سارا سال برف جمی رہتی ہے گھاس پھوس کا کہیں نام و نشان نہیں ہوتا۔ زمین برف سے سفید اور سمندر پر بھی برف ہی برف۔ زمین کے اس خطّے کو خطّۂ منجمد شمالی کہتے ہیں۔

اس خطّے میں جو خشکی کے جانور پائے جاتے ہیں، اُن میں برفانی ریچھ کافی دل چسپ جانور ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اس ریچھ کا رنگ برف کی طرح سفید ہوتا ہے اور یہ ریچھ سردی کے موسم میں سوتا نہیں، کیوں کہ سردی تو وہاں ہمیشہ ہی ہوتی ہے اور دن رات کا بھی کوئی فرق نہیں۔ چھے مہینے تک دُور اُفق پر سورج مسلسل چمکتا ہے اور چھے مہینے تک شام کے جھٹ پٹے جیسا ہلکا ہلکا اندھیرا رہتا ہے۔

برفانی ریچھ عام طور پر سمندر کے کنارے پر رہتا ہے، کیوں کہ اُسے اپنی خوراک سمندر کے علاوہ اور کہیں نہیں مل سکتی۔

سورج نکلنے پر اگر کہیں برف پگھل جائے اور کچھ گھاس اُگ آئے تو وہ گھاس بھی کھا لیتا ہے، لیکن اکثر ریچھوں کو عمر بھر کبھی گھاس نصیب نہیں ہوتی۔ یہ ریچھ عام طور پر ساحل پر برف کے تودوں پر ستاتے ہوئے سیل کا شکار کرتے ہیں۔ شکار کے لیے سمندر میں بھی کود پڑتے ہیں لیکن اتنا تیز نہیں تیر سکتے، جتنا تیز سیل تیر لیتا ہے۔

قطب شمالی کی سفید لومڑیاں عام طور پر ریچھوں



کا پیچھا کرتی رہتی ہیں، تاکہ ریچھ جب کوئی شکار مارے تو بچا کھچا اُنھیں بھی کچھ کھانے کو مل جائے۔ ویسے جنگل کی دُنیا میں یہ بات انوکھی نہیں۔ ایسے کئی جانور ہیں، جو خود شکار نہیں کر سکتے اور اس لیے ہمیشہ بڑے اور طاقتور جانوروں کی ٹوہ میں رہتے ہیں کہ کب وہ شکار ماریں اور بچا ہوا گوشت کھانے کو ملے۔ ان طفیلی جانوروں کی وجہ سے خوراک ضائع نہیں ہوتی۔

کناڈا کے شمالی جزیروں کے ساحلوں پر برفانی ریچھوں کو کبھی کبھی وہیل مچھلی جیسا شکار بھی مل جاتا ہے۔ آپ حیران ہوں گے کہ بھلا ریچھ وہیل مچھلی کو کیسے شکار کر سکتا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ وہیل مچھلی کو ریچھ نہیں بلکہ سمندر کی طوفانی لہریں شکار کرتی ہیں اور سمندر سے اُٹھا کر ساحل پر پھینک دیتی ہیں، جہاں وہ تڑپ تڑپ کر مر جاتی ہیں۔ برفانی ریچھ کو یُوں شکار مل جائے تو گویا مہینوں کے لیے دعوت کا انتظام ہو جاتا ہے۔

ریچھ کی بیگم برف کی کھوہ میں رہتی ہے۔ ہر سال جنوری کے مہینے میں ان کے ہاں دو گول مٹول جڑواں بچے پیدا ہوتے ہیں۔

بیگم ریچھ کا وزن یہی کوئی چھ آدمیوں کے وزن کے برابر ہوتا ہے، لیکن بے بی ریچھ جب پیدا ہوتا ہے تو اُس کا وزن آدھ سیر سے زیادہ کبھی نہیں ہوتا۔ بچّوں کی پیدائش سے پہلے کھوہ کا منھ نرم برف کے تودوں سے بند کر دیا جاتا ہے، کیوں کہ جب بچّے پیدا ہوتے ہیں تو اُن کی آنکھیں بند ہوتی ہیں اور جسم پر بال بھی نہیں ہوتے۔ چناں چہ دونوں بچّے تقریباً چھے ہفتے تک اپنی اماں کی گرم گرم گود میں چھپے رہتے ہیں۔

چھے ہفتے بعد جب بچّوں کی آنکھیں کھُلتی ہیں تو اس وقت تک ان کے جسم پر سفید ریشم جیسے نرم بالوں کے کوٹ ہوتے ہیں اور وہ کھیلتے ہوئے یوں لگتے ہیں، جیسے دُھنکی ہوئی روئی کے گالے ہوا سے اُڑ رہے ہوں۔

بیگم ریچھ اپنے ننھے مُنے بچّوں کی صحت کا بہت خیال رکھتی ہیں۔ آنکھیں کھُل جانے کے بعد وہ اُنھیں اپنے ساتھ اندھیری کھوہ میں چھپائے رکھتی ہیں اور جب دو ہفتے اور گزر جاتے ہیں تو وہ اپنے پنجوں سے برف کھود کر کھوہ کا دروازہ کھولتی ہیں اور اپنے ننھے مُنّوں کو پہلی بار کھُلے آسمان کے نیچے باہر لے کر آتی ہیں۔

اگر آپ کبھی کسی چڑیا گھر میں برفانی ریچھ کو دیکھیں تو وہ یقیناً بہت خوب صورت جانور نظر آئے گا تمام جسم سفید بالوں سے ڈھکا ہوا۔ آنکھیں سیاہ، لیکن بہت چمکیلی، ناک ایسی جیسے سیاہ مخمل کی کوئی چھوٹی سی گدّی ہو اور پنجوں کے نیچے تلوؤں کا رنگ بھی سیاہ ہوتا ہے۔



اچّھا بچّہ

انجم اعظمی



گھر ہے جب گھر میں بچّے ہوں — کیا کہنا گر سب اچھے ہوں
کھیلیں کُودیں اور پڑھیں سب — آپس میں مل جُل کے رہیں سب
بڑوں کو کرتے ہوں آداب — عادت کوئی ہو نہ خراب!
کھانا پینا سونا سیکھیں — ہنسنا رونا جینا سیکھیں
ماں اور باپ کی باتیں سُن کر — باتیں خود بھی کریں وہ بہتر
دُور رہیں گالی جھگڑے سے — رغبت ہو ان کو پڑھنے سے
سیر کریں، تفریح کو جائیں — لیکن جلدی لَوٹ کے آئیں
گھر سے دُور رہیں گے جب تک — ماں کے دل میں آئیں گے شک



ماں کو خوش رکھنا ہے اچّھا
جو خوش رکھے اچّھا بچّا

SAMI. 65

آئرلینڈ کی لوک کہانی

وائلن والا مداری



ایک دن صبح کے وقت ایک مداری وائلن بجاتا شہر کی گلیوں میں پھر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک خوب صورت سی بلی بھی تھی۔ دکانیں کھلتی جا رہی تھیں۔ لوگ باگ اپنے دفتروں اور کاموں پر جانے کے لیے تیزی سے قدم بڑھاتے چلے جا رہے تھے۔ عورتیں اپنے

اپنے مکانوں کی صفائی میں مصروف تھیں۔ ایک دودھ والا محلے محلے گھروں پر دودھ پہنچاکر آرہا تھا۔ وائلن والے مداری نے اس دودھ والے سے کہا، "بھائی میں تمھارے شہر میں اجنبی ہوں۔ مجھے یہاں کے بازار کا کچھ پتہ نہیں۔ ذرا اتنا بتادو کہ کوئی کھانے کی دکان بھی یہاں قریب ہے، جہاں میں ناشتہ کر لوں؟"

دودھ والے نے مسکرا کر سب سے پہلے اُس کے ساتھ پھدکتی کودتی ہوئی بلی کو دیکھا اور چمکارتے ہوئے اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرنے لگا، پھر بولا، "میں تمھیں ابھی بتاتا ہوں۔ پہلے تم یہ بتاؤ کہ اتنی خوب صورت بلی تم کہاں سے لائے۔ یہ مجھے دے دو اور منھ مانگے دام لے لو۔"

مداری بولا، "یہ بلی تو مجھے جان کی برابر پیاری ہے۔ یہ میں کسی قیمت میں بھی تمھیں نہیں دے سکتا۔ تم اس کا کیا کرو گے؟ دودھ والے نے کہا، "ایک تو یہ مجھے پیاری لگتی ہے اور دوسرے یہ میرے بڑے کام کی ہے۔ گھر میں چھوڑ دوں گا تو سارے چوہے کھا جائے گی، جو میرا سیروں دودھ روزانہ پی جاتے ہیں۔ میں اسے دودھ ملائی کھلایا کروں گا۔"

مداری نے جواب دیا، "ہرگز نہیں میں تو اسے کسی قیمت پر بھی نہیں دُوں گا۔ یہی تو میرے ہاتھ پاؤں ہے۔ تم اس کے کرتب دیکھو گے تو حیران رہ جاؤ گے اور پھر یہ تمھارے پاس رہ بھی نہیں سکتی۔ یہ عجیب و غریب بلی ہے۔"

دودھ والے نے مداری کو بہت منانے کی کوشش کی اور بھاری رقم کا لالچ دیا، مگر مداری اس کی ایک نہ مانا، پھر اس نے اپنا وائلن بجانا شروع کیا اور وائلن کا نغمہ سُنتے ہی بلی



نے بڑے مزے سے ناچنا شروع کر دیا۔ وہ چاروں طرف کودتی ناچتی عجیب عجیب تماشے دکھانے لگی، اتنے میں چاروں طرف لوگ جمع ہو گئے۔ بوڑھے بچے جوان سب ہی اس بلّی کا ناچ دیکھنے آ گئے اور اس کے عجیب کرتب دیکھ کر تعجب کرنے لگے اور "واہ واہ" کا شور مچا دیا۔ ایک کارنیوال کا مالک بھی وہاں کھڑا تھا، اُس نے کہا،

"ایسی عجیب بلی چوہے پکڑنے کے کام میں نہیں لائی جا سکتی۔ دودھ والے کے لیے تو یہ بیکار ہے۔ لاؤ تم اسے مجھ کو دے دو۔ جو قیمت مانگو گے ابھی دوں گا۔ یہ میرے کارنیوال میں شان دار کام کرے گی۔"

مداری نے اس سے بھی انکار کیا۔ کہنے لگا، "جناب، میں تو کسی بھی قیمت پر نہیں بیچ سکتا۔ ایسی عجیب بلی بھلا کسی کو مِلا کرتی ہے۔" یہ کہہ کر اس نے وائلن بجانا بند کر دیا۔ بلّی نے ناچنا بند کر دیا اور کسی سے کھانے کی دکان کا پتہ معلوم کر کے ناشتہ کرنے چل دیا۔

پھر اُس نے ایک بازار میں قسم قسم کے نغمے بجائے اور عجیب بلّی کے نئے نئے ناچ تماشے لوگوں کو دکھائے۔ خوش ہو کر جو جس سے ہو سکا خوب انعام دیا۔

مداری اس شہر میں کئی روز رہا اور بازاروں، گلیوں میں وائلن بجا کر اپنی بلّی کے کھیل کرتب دکھا کر انعام لیتا رہا۔ لوگ اِس بلّی کے تماشے دیکھ کر تعجب اور خوشی سے دیوانے ہو گئے۔ مداری نے خوب دولت کمائی۔

ایک دن کسی نے اس شہر کے حاکم کو بھی اس عجیب بلّی اور مداری کا حال بتایا۔ حاکم نے مداری کو اپنے دربار میں بُلوایا اور اس کے مزے دار تماشے دیکھے۔ مداری نے حاکم کے سامنے ایسا وائلن بجایا، جو کبھی پہلے نہ بجایا تھا اور بلی نے بھی ایسے ناچ دکھائے کہ اس سے پہلے نہ دکھائے تھے۔ بادشاہ بیحد خوش ہوا۔ اس کے خاندان کے لوگ اور امیر جو دربار میں جمع تھے، سب نے اس عجیب بلّی اور مداری کی بڑی تعریف کی اور بھاری انعام ملا۔ اس کے بعد حاکم نے مداری سے کہا، "یہ بلّی ہمیں دے دو۔ ہم تم کو مالا مال کر دیں گے۔" مداری نے حاکم کو بھی وہی جواب دیا، جو اس سے پہلے دیتا آیا تھا اور حاکم کو بلی دینے سے صاف انکار کر دیا۔ حاکم نے اسے بہت سمجھایا اور کہا کہ "ہم تم کو منھ مانگی قیمت اور بڑا انعام دیں گے۔"

مداری نے جواب دیا، "جناب عالی، میری بلّی کی کوئی قیمت ہی نہیں ہے۔" آخر

حاکم نے خفا ہو کر کہا، "اچھا تو پھر جاؤ۔ ہم کوئی قیمت نہیں دیں گے۔ اب یہ بلی ہماری ہے۔ تم اسے اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتے۔" اور اس کے اشارے پر دو سردار بلی کو اُٹھا کر حاکم کے محل کو روانہ ہو گئے۔ مداری بے چارہ دیکھتا رہ گیا۔ سوائے رونے دھونے کے اور کیا کر سکتا تھا۔ بِلّی حاکم کے محل میں پہنچ گئی



اور مداری غمگین صورت بنائے دوسری طرف چلا گیا۔ راستے میں اس نے سوچا کہ کیا پرواہ ہے، بِلّی تو میرے وائلن کا نغمہ سُن کر ناچتی ہے۔ حاکم کے سامنے میرے بغیر کیسے ناچے گی، لیکن حاکم نے اپنے درباری باجے بجانے والوں کو فوراً بُلا کر حکم دیا کہ تم سب اپنے اپنے باجوں پر نغمے سُناؤ۔ ہم اس بلی کا ناچ اپنے محل میں دیکھنا چاہتے ہیں۔

ایک دن حاکم اور اس کے سارے گھر والے، عزیز رشتے دار محفل جما کر بڑے ٹھاٹھ سے بیٹھ گئے۔ باجے والوں نے خوب شان دار نغمے بجانا شروع کیے۔ بِلّی ان کو سُن کر مزے سے ناچنے بھی لگی۔ بڑی تعریفیں ہوئیں۔ یہ جلسہ ساری رات اسی طرح ہوتا رہا۔ صبح کو حاکم نے کہا، "بس اب ختم کرو۔" باجے بند ہو گئے، مگر بلّی کا ناچ ہوتا رہا۔ حاکم نے بلّی سے کہا، "بس بس اب ناچنا بند کر!" بلّی ناچتی رہی۔ حاکم اور سب لوگ ناچ دیکھتے دیکھتے تھک گئے، مگر بلّی کب تھکنے والی تھی۔ اس کو ناچ بند کرنا تھا، نہ کیا۔ حاکم نے خفا ہو کر اُسے ڈانٹا۔ سب نے ایک ایک کر کے شور مچایا، کہ بلّی بلّی ناچ بند کر۔" اور بلّی تھی کہ ناچے جا رہی تھی۔ اب

تو حاکم کو بیحد غصہ آیا۔ اس نے ایک سردار کو حکم دیا، "اس بد تمیز بلّی کو پکڑ لو۔" مگر بلّی اتنی تیزی سے اُچھلتی کودتی پھر رہی تھی، ایک نہیں کئی سردار اسے پکڑنے کے لیے دَوڑتے دَوڑتے تھک گئے۔ وہ کسی کے ہاتھ نہ آئی اور مزا یہ کہ سارے سردار بھاگتے بھاگتے بلّی کے پیچھے دَوڑنے اور پکڑنے کے بجائے خود بھی ناچنے لگے۔ اتنے میں محفل کے سارے مرد عورتیں بچے ناچنے کھڑے ہو گئے۔ حاکم تنگ آ گیا۔ وہ جتنا چیختا چلاّتا اور غصّہ دکھاتا، اتنا ہی بلی تیز ناچتی اور اتنا تیز اس کے ساتھ ساتھ دوسرے لوگ بھی ناچتے جاتے۔

حاکم غصّے سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے۔ آخر باہر سے پہرے داروں کو بُلوایا اور ان سے کہا، "فوراً ایک سوار کو حاضر کرو۔" جب سوار آیا تو اس نے اُسے حکم دیا کہ "دوڑتے ہوئے جاؤ اور جس طرح ہو سکے اس نامعقول مداری کو پکڑ کے ہمارے سامنے لاؤ۔ یہ کیا بلا ہمارے سر ڈال گیا کم بخت!"

اور سوار حاکم کی تعمیل کے لیے سرپٹ گھوڑا دَوڑاتا۔ سارے شہر میں مداری کو تلاش کرنے لگا۔ کونہ کونہ چھان مارا۔ ایک ایک سرائے، بازار اور گلیاں ڈھونڈ ڈالیں۔ آخر بڑی مشکل سے وہ ایک چائے کی دکان میں بیٹھا وائلن بجاتا ہوا ملا۔ سوار گھوڑے سے اُتر کر دکان میں گیا اور اُسے پکڑ کر اپنے ساتھ گھوڑے پر سوار کرا کے حاکم کے محل پہنچ گیا۔

مداری اپنی بلّی کے ساتھ ساری محفل کو ناچتے کودتے دیکھ کر خوب ہنسا۔ حاکم نے





اُسے ڈانٹا اور حکم دیا:

"جلدی بند کرو اس کھیل تماشے کو، ورنہ ہم تمھاری گردن اُڑا دیں گے۔" مداری بڑے آرام سے ایک طرف کھڑے ہوکر وائلن پر ایک نغمہ بجانے لگا۔ بلی نے اس کی آواز سُنتے ہی ناچنا بند کر دیا اور اس کے ساتھ سب ناچنا بند کر کے اپنی اپنی جگہ گر پڑے، کیوں کہ وہ بیحد تھک گئے تھے۔ بلی مداری کی ٹانگوں سے لپٹ گئی اور حاکم نے مجبور ہوکر حکم دیا:

"اپنی بلی یہاں سے لے جاؤ۔" مداری بلی کے ساتھ خوشی خوشی محل سے نکل کر بازاروں میں گھومنے لگا۔

مجسٹریٹ: (ملزم سے) تم نے جرم بڑی ہوشیاری اور صفائی کے ساتھ کیا ہے!

ملزم: صاحب آپ کا شکریہ، آپ پہلے آدمی ہیں، جس نے میرے کام کی تعریف کی ہے۔

ایک دوست: آج کل ریڈیو سے بڑی گرما گرم خبریں آ رہی ہیں!

دوسرا دوست: اچھا، تو یہی وجہ ہے جو ہمارا ریڈیو سیٹ گرم ہو جاتا ہے۔

حکیم صاحب: (لڑکے سے) تمھیں بخار کس وقت آتا ہے؟

لڑکا: جناب، اسکول جانے سے ذرا پہلے۔

ماسٹر: وقار، تم نے ڈرائنگ کا کام کیوں نہیں کیا؟

وقار: جناب، ہمارے ہاں ڈرائنگ روم ہی نہیں۔

خطرناک سفر



مناظر صدیقی

تیرہ سالہ لڑکے نے وہ کام کر دکھایا جو بڑوں کے لیے بھی مشکل تھا

سردیوں کا موسم تھا۔ ہر طرف برف گر رہی تھی۔ ساتھ ساتھ تیز تیز ہوائیں چل رہی تھیں۔ یہ تیز ہوائیں جان کو ایسی معلوم ہوتیں، جیسے کوئی اس کے بدن پر کوڑے مار رہا ہو۔ اس نے ایک کمبل میں اپنی ننھی منی بہن کو لپیٹ کر اپنے سینے سے لگا رکھا تھا۔ اس کی ننھی منی بہن اس کے سینے سے لگی ہوئی بالکل خاموش تھی۔ ایک چھوٹی سی بھوری بھوری رنگت والی پہاڑی پر چڑھ کر ایک مکان کے سامنے جان رک گیا۔ یہ مکان لکڑی کے تختوں سے بنا ہوا تھا۔ جان نے اپنی نیلی نیلی آنکھیں اٹھا کر مکان کی طرف دیکھا۔ مکان کی چمنی میں سے دھواں نکل رہا تھا۔ پھر اس نے پلٹ کر اپنی گائے کی طرف دیکھا، جس کی پیٹھ پر اس کی دو بہنیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ اس کی بڑی بہن کا پیر ٹوٹا ہوا تھا اور اسی لیے اس کے سامنے بیٹھی ہوئی چھوٹی بہن کی گود میں اس کا پیر رکھا ہوا تھا۔ گائے کے برابر اس کا ایک اور چھوٹا بھائی آ رہا تھا، جس کی عمر دس سال تھی۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹی بہن کا ہاتھ تھا، جس کی عمر صرف تین سال تھی۔ گائے کے پیچھے پیچھے ایک اور بہن تھی اس کی عمر ۱۱ سال کے قریب تھی۔ اس قافلے کا سردار جان تھا، جس کی عمر تیرہ سال تھی۔ ان سب کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ پیروں میں چھالے پڑے ہوئے تھے اور سردی کی وجہ سے نیلے پڑ گئے تھے۔ سب کے بال مٹی اور دھول سے اٹے ہوئے تھے۔

جان نے ایک مرتبہ پھر لکڑی کے اس مکان کی طرف دیکھا۔ وہ دوڑ کر اندر گھس جانا چاہتا تھا

لیکن بے چارا راستے ہی میں گر پڑا۔

یہ واقعہ آج سے ۱۱۵ سال پہلے امریکا میں پیش آیا تھا۔ اُس زمانے میں امریکا میں خانہ جنگی ہو رہی تھی۔ برطانیہ اور امریکا کے رہنے والے ایک دوسرے سے لڑ رہے تھے۔ ایک طرف امریکا کی آزاد حکومت پورے امریکا کو اپنے قبضے میں کرنا چاہتی تھی تو دوسری طرف برطانیہ والے چاہتے تھے کہ امریکا پر ان کا قبضہ ہو۔

۱۸۴۴ء میں جان اور اس کا خاندان امریکا میں گرین ندی کے کنارے ٹھہرے ہوئے تھے۔ ایک روز اس علاقے کا مشہور اسکاؤٹ کٹ کارسن ایک گھوڑے پر سوار تیزی سے اُن کے پاس پہنچا۔ اس وقت جان اور اُس کی بہنیں سردی کی وجہ سے آگ کے پاس بیٹھی ہاتھ تاپ رہی تھیں۔ کِٹ کارسن نے چیخ کر کہا، "یہ آگ بجھا دو۔" پھر اُس نے جان سے پوچھا،

"تمھارے گھر والے دوسرے آدمی کہاں ہیں؟"

"وہ لوگ اندر گاڑی میں لیٹے ہوئے ہیں انھیں سخت بخار ہے۔" جان نے کہا۔

"اور قافلے کے باقی لوگ کہاں ہیں؟" کٹ کارسن نے پوچھا۔

"ہمارے ابا جب گاڑی چلانے کے قابل نہیں رہے تو وہ لوگ انھیں چھوڑ کر چلے گئے۔ انھیں گئے ہوئے بھی اب دو روز گزر چکے ہیں۔" جان نے جواب دیا۔



اگر تم اپنی گاڑی چلا سکو تو فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔ اگر تم ایک دن اور ایک رات تک مسلسل گاڑی چلاتے رہے تو پھر تم ہر خطرے سے بچ جاؤ گے۔" کارسن نے جواب دیا۔

کارسن کی ہدایت پر جان نے اپنی گاڑی میں بیل جوت کر انھیں ہانکتے ہوئے اپنا سفر شروع کر دیا۔

دو دن کے بعد یہ تھکا ہوا بھوکا قافلہ یعنی جان، اس کے بھائی بہن اور بیمار ماں باپ ایک ندی کے کنارے پہنچے۔ اس ندی کا نام ہیٹر ندی تھا اور جس جگہ یہ لوگ جا کر رُکے تھے، اس کا نام سوڈا اسپرنگ تھا۔ اس مقام پر جان کے پہنچنے سے پہلے ہی پانچ چھ خاندان اور ٹھہرے ہوئے تھے۔ اُن میں سے ایک ڈاکٹر بھی تھا۔ جان کی گاڑی دیکھتے ہی وہ لوگ جیسے ہی اس ٹوٹی پھوٹی گاڑی کے قریب پہنچے تو جان نے کہا،

"مجھے ایک ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔ میرے ماں باپ گاڑی میں بیمار پڑے ہیں۔"

جان کی آواز سن کر اُن میں سے ایک بوڑھا آدمی آگے بڑھا اور مجمع کو چیرتا ہوا جان کے قریب پہنچ کر اُس سے پوچھنے لگا،

"کیوں بیٹے کیا بات ہے؟"

"میرے ماں باپ دونوں ہی گاڑی میں بیمار پڑے ہیں۔" جان نے کہا۔ "اماں کی حالت تو یہ ہے کہ وہ میرے چھوٹے بھائی کو دودھ بھی نہیں پلاتی ہیں، دو دن میں کئی مرتبہ اسے گائے کا دودھ پلانے کی کوشش کی لیکن وہ گائے کا دودھ پیتا ہی نہیں۔"



جان کی بات سن کر ایک بڑھیا آگے بڑھی اور اس نے بڑی محبت سے جان کے سر پر ہاتھ پھیر کر اُسے چمٹا لیا۔ اسی وقت وہ بوڑھا آدمی جان کی گاڑی میں چڑھ گیا، لیکن فوراً ہی واپس آگیا، پھر اُس نے سب بچوں اور مجمع کے دوسرے آدمیوں کو دیکھتے ہوئے کہا،

"افسوس ہے کہ ہم اب کچھ نہیں کر سکتے وہ دونوں تو مر چکے ہیں!"

بوڑھے کی زبان سے یہ باتیں سن کر جان کی بڑی بہن رونے لگی، لیکن جان نے ہمت کی اور گاڑی میں چڑھتے ہوئے کہا،

"جھوٹے... جھوٹے کہیں کے...."

جان اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ پایا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے، لیکن اس نے صبر سے کام لیا اور بالکل نہیں رویا۔ آس پاس کے کھڑے ہوئے آدمیوں نے بے چارے جان کی ہمت بندھائی اور سب نے مل کر اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا،

"بیٹے صبر کرو۔ خدا کی مرضی یہی تھی۔ تم بالکل مت گھبراؤ، ہم لوگ خود ہی سارا انتظام کر لیں گے۔ اللہ میاں جو کچھ کرتے ہیں، اچھا ہی کرتے ہیں۔"

بے چارے جان پر تیرہ سال ہی کی عمر میں یہ مصیبت آپڑی تھی۔ اس نے آنسو بھری آنکھوں سے اپنی بہنوں اور چھوٹے بھائیوں کی طرف دیکھا۔ اس وقت صدمے اور رنج سے جان کا بدن کانپ رہا تھا، لیکن فوراً ہی اُسے خیال آگیا کہ اب وہی سب سے بڑا ہے، اس لیے ان سب کی ذمّہ داری اس پر ہے۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے جوش اور ہمّت سے مٹھیاں بھینچ کر اپنے بھائیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا،

"تم لوگ کوئی فکر نہ کرو۔ ابھی تو میں زندہ ہوں۔ میں تم سب کا خیال کروں گا۔ تمھیں کوئی تکلیف نہ ہونے دوں گا۔"

پھر وہ سب بچے اپنی گاڑی میں بیٹھ کر فورٹ ہال پہنچے۔ یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ یہاں پر ایک تجارتی کمپنی نے اپنا دفتر بنا رکھا تھا۔ یہاں پر اسی کمپنی کے ایک آدمی نے جان کو بتایا کہ اس علاقے کے رہنے والے پُرانے امریکی باشندے جنھیں ریڈ انڈین کہتے ہیں آج کل بہت پریشان کر رہے ہیں وہ مال لے جانے والی گاڑیوں پر حملہ کرکے انھیں لوٹ لیتے ہیں۔

جان نے ان کی باتیں سنیں، لیکن اُسے فوراً خیال آگیا کہ اس کے باپ کی خواہش تھی کہ وہ کولمبیا کے زرخیز علاقے میں کھیتی باڑی کرے گا اُسے اچھی طرح یاد تھا کہ اس کا باپ کہا کرتا تھا،

"اگر ہم کولمبیا کے زرخیز علاقے میں کھیتی باڑی کرنے لگے تو اس طرح اوریگن کا علاقہ بھی آسانی

سے امریکی ریاست میں شامل ہو سکے گا۔"

جان کو اپنے باپ کی وصیت یاد آئی تو فوراً اسے اپنے ماں باپ کی موت کا خیال بھی آگیا، پھر وہ اپنی ماں اور اپنے باپ کو یاد کر کے خوب رویا اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اب وہ خود ہی اپنے باپ کی خواہش پوری کرے۔ اسی خاطر تو وہ لوگ اپنا گھر بار چھوڑ کر اتنے دور دراز کے سفر کے لیے نکلے تھے اور راستے ہی میں اُس کی ماں اور اُس کا باپ دونوں چل بسے۔ یہ سوچ کر جان نے دل میں پختہ ارادہ کر لیا کہ وہ ہر قیمت پر اپنے باپ کی خواہش پوری کرے گا، لیکن اُسے معلوم تھا کہ فورٹ ہال میں رہنے والے اُسے کبھی تنہا نہ جانے دیں گے۔ آخر کار سوچتے سوچتے اس کے ذہن میں ایک ترکیب آ ہی گئی۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ جان چُپ چاپ اُٹھا اور اس نے اپنے بہن بھائیوں کو بھی خاموشی سے اٹھا لیا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اپنے بیل یہیں چھوڑ جائے گا۔ چناں چہ اس نے اپنا تھوڑا بہت سامان اور کھانے پینے کی تمام چیزیں اپنی گائے کی پیٹھ پر باندھیں۔ ایک عورت نے جان کو یہ بھی سکھا دیا تھا کہ چھوٹا بچہ بھوکا ہو تو اس کا پیٹ بھرنے کے لیے کس طرح اسے دودھ پلانا چاہیے۔ جان نے اپنے سب سے چھوٹے بھائی کو ایک کمبل میں لپیٹ کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ اس کے پاس جتنے بھی کمبل تھے، اُن میں یہ کمبل سب سے زیادہ گرم تھا۔

وہ لوگ جب باہر نکلے تو جان کے چھوٹے بھائی بہن اپنے اس نئے سفر پر شروع میں خوشی کی وجہ سے بہت ہنسے۔ باہر نکلتے ہی جان کچھ سوچ کر ذرا سی دیر کے لیے رکا اور پھر واپس پلٹ کر اس نے کاغذ کے ایک ٹکڑے پر ایک پرچہ لکھا:

"میں اپنے خاندان کو واپس امریکی ریاست میں لے جا رہا ہوں — جان سیگر"

جان کا خیال تھا کہ اس چھوٹی اطلاع سے برطانوی یا امریکی دونوں میں سے کوئی بھی اُس کا پیچھا نہ کرے گا اور وہ اپنی منزل تک اطمینان سے پہنچ جائے گا۔ جان کی یہ ترکیب سچ مچ کام آگئی اور فورٹ ہال میں رہنے والے امریکی اس کا پیچھا کرنے کے بجائے دوسری طرف چلے گئے۔

کئی ہفتے تک جان اپنے بھائیوں اور بہنوں کے ساتھ دریائے اسنیک کے کنارے کنارے چلتا رہا۔ دریائے اسنیک اس علاقے میں مشرق سے مغرب کی سمت بل کھاتا ہوا بہتا تھا۔ دن کے وقت تو سورج کی گرمی اس قافلے کو پریشان کرتی۔ سخت دھوپ میں اُن کے بدن جھلس جاتے اور رات کے وقت وہاں سخت سردی پڑتی۔ اُن لوگوں کو سردی سے بچنے کے لیے ایک دوسرے سے چمٹ کر بیٹھنا پڑتا تاکہ اس طرح

وہ کچھ سکون حاصل کر سکیں۔ ایسے وقت میں جان اپنے ننھے منے بھائی کو ہمیشہ اپنی گود میں ہی رکھتا۔ دن کے وقت راستہ چلتے چلتے جان خرگوش اور چڑیوں کا شکار کرتا اور اُس کی بہنیں جنگلی پھل وغیرہ چُن لیتیں۔ اس طرح اُن لوگوں کا پیٹ بھر جاتا۔ اُن کی گائے ان کے لیے دُودھ بھی دیتی اور ساتھ ساتھ وہ لوگ باری باری اُس پر سواری بھی کرتے۔

مچھروں، مکھیوں اور جنگلی کیڑے مکوڑوں کا مقابلہ کرتے ہوئے یہ بہادر لڑکا اپنے چھوٹے سے قافلے کو تقریباً تین سو میل دور تک لے گیا۔ جس علاقے میں وہ سفر کر رہا تھا، وہاں بڑا ہی خوف ناک جنگل تھا، لیکن وہ ذرا بھی پریشان نہ ہوا۔ آخر کار ایک دن وہ لوگ فورٹ بوائس نامی گاؤں میں داخل ہوئے۔

یہ گاؤں دراصل ایک قلعہ تھا۔ اُس زمانے میں امریکا میں چوں کہ بہت سے ملکوں نے علیحدہ علیحدہ اپنی اپنی ریاستیں بنا رکھی تھیں، اس لیے اس علاقے پر اسکاٹ لینڈ والوں کی حکومت تھی۔

فورٹ بوائس کے رہنے والوں نے جب جان اور اس کے ساتھیوں کو دیکھا تو انھیں بہت صدمہ ہوا۔ جان کی حالت تھی بھی ایسی ہی، اس کے بدن پر صرف ایک پھٹی پُرانی پتلون تھی۔ بال بڑھے ہوئے اور اُلجھے ہوئے تھے بے چارے کو اپنے بالوں میں کنگھا کرنے کا موقع ہی کب ملتا تھا۔ اُس کے بہن بھائیوں کی بھی حالت ایسی ہی تھی۔ سارے کپڑے پھٹ گئے تھے۔ بدن پر چیتھڑے لٹکے ہوئے تھے اور بدن بے حد میلے تھے خاص طور پر جان کا وہ ننھا بھائی جو اس کی گود میں تھا بڑی بُری حالت میں تھا۔ اُس بے چارے کو دودھ بھی ٹھیک طرح سے نہیں مل سکا تھا۔ پھر ننھی سی جان سخت سردی اور گرمی بھلا کیسے برداشت کرتی۔ اسے دیکھ کر ہی سب لوگوں کو رحم آنے لگا۔

فورٹ بوائس کے قلعے میں ایک چھوٹا سا تجارتی اڈہ بھی تھا، جہاں قریب کے دیہاتوں میں رہنے والے اپنا اپنا اناج وغیرہ لاکر بیچتے اور اپنی ضرورت کی چیزیں خرید لے جاتے۔ اس تجارتی اڈے کا سب سے بڑا افسر اسکاٹ لینڈ کا رہنے والا تھا، اُسے اِن بچّوں کی حالت پر بڑا رحم آیا۔ اُس نے اپنے باورچی سے کہا کہ ان بچّوں کو کھانا کھلائے۔ گاؤں میں کوئی امریکی یا برطانوی عورت نہیں تھی۔ البتہ امریکا کے پُرانے باشندے ریڈ انڈین وہاں رہتے تھے۔ اس نے ایک ہندی عورت سے کہا کہ وہ جان کے چھوٹے بھائی کی حفاظت کرے، اُسے دودھ پلائے، لیکن جان نے اُسے اجازت نہ دی

وہ اپنے چھوٹے سے بھائی کو بہت زیادہ چاہتا تھا، اس لیے اُس نے اپنے بھائی کو اپنی گود سے علیحدہ نہ کیا۔

جان کی بہنیں زمین پر ہی بیٹھ گئیں انھیں سخت بھوک لگ رہی تھی، پھر جب اُس باورچی نے اُن کے سامنے کھانا لاکر رکھا تو وہ سب کی سب بہت دنوں کے بعد پکا ہوا کھانا ملنے کی وجہ سے جلدی جلدی مُنھ میں نوالے رکھنے لگیں۔ جان اور اس کا وہ بھائی جس کی عمر گیارہ سال تھی، دونوں ایک طرف کھڑے رہے۔ دونوں نے اپنے اپنے ہاتھوں میں گوشت کا ایک ایک ٹکڑا اٹھالیا اور اپنی بہنوں کو پیٹ بھرتے ہوئے دیکھتے رہے۔

جان بہت زیادہ تھکا ہوا تھا۔ اتنا زیادہ کہ اس کے لیے ایک قدم اٹھانا بھی مشکل تھا لیکن اُس نے تو عہد کر رکھا تھا کہ جب تک وہ اپنا مقصد پورا نہ کرے گا، اس وقت تک چین سے نہ بیٹھے گا اور اُس کا مقصد اپنے مرے ہوئے باپ کے ارادے کو پورا کرنا تھا۔ جان اپنے عہد کو پورا کرنا چاہتا تھا، اس لیے اس نے آرام کرنے کا خیال اپنے دل سے نکال دیا۔

تجارتی اڈے کے افسر نے جان کو مشورہ دیا کہ اگر جان اپنا سفر جاری رکھنا ہی چاہتا ہے تو بہتر یہ ہے کہ وہ اپنی چھوٹی بہنوں اور ننھے منے بھائی کو فورٹ بوائس ہی میں چھوڑ دے۔ لیکن جان اس بات پر راضی نہ ہوا۔ اس افسر نے جب یہ دیکھا کہ جان کے دل میں اپنے بھائی بہنوں کی محبت بہت زیادہ ہے اور اُسے اپنی اس ذمّہ داری کا احساس ہے کہ اب وہی اپنے خاندان میں سب سے بڑا ہے تو اُس نے جان کو سفر کی اجازت دے دی، البتہ اُس افسر نے جان کے ساتھ راستے میں کھانے پینے کی چیزیں باندھ دیں۔ جان کے ساتھ تازہ دم گھوڑے بھی بھیج دیے اور راستہ بتانے کے لیے ۲ دو ریڈ انڈین آدمیوں کو بھی ساتھ کر دیا۔

ریڈ انڈین آدمیوں نے اس وقت تو افسر کے سامنے کچھ نہ کہا، لیکن راستے میں انھوں نے جان کی بہت بے عزتی کی اور ۲ دو دن کے سفر کے بعد وہ لوگ گھوڑے اپنے ساتھ لے کر جان اور اس کے بھائی بہنوں کو جنگل میں تنہا چھوڑ کر غائب ہو گئے۔ جان نے اپنی سب سے چھوٹی بہن کو گائے پر بٹھا دیا اور باقی بہنوں اور بھائیوں کو اپنے ساتھ ساتھ رکھا۔ اس طرح کہ اُس نے ایک بھائی کی انگلی پکڑلی اور اس بھائی نے دوسری بہن کی اس طرح سب کے سب جان کے ساتھ ہی رہے۔ جان نے یہ ترکیب اس لیے اختیار کی، تاکہ ایسا نہ ہو کہ وہ آگے نکل جائے اور اس کے بھائی بہن پیچھے پیچھے ٹھوکریں کھاتے رہیں کبھی کبھی

جب وہ لوگ رونے لگتے تو جان انھیں یہ کہہ کر سمجھالیتا کہ اب وہ جلد ہی کولمبیا کے زرخیز علاقے میں پہنچ جائے گا۔ ایک یا دو مرتبہ بڑی بہنوں نے جان سے کہا کہ وہ ننھے بچے کو جو ابھی تک جان کی گود میں تھا، اپنی بہنوں کے حوالے کر دے، تاکہ تھوڑی دور تک وہ اُسے سنبھال لیں، لیکن جان نے اُن کی بات نہ مانی۔ کبھی کبھی جب وہ لوگ تھک کر ایک جگہ بیٹھ جاتے تو جان اپنے ننھے منے بھائی کو اپنی گود میں لٹاکر اس طرح ہلانے لگتا جیسے اس کی ماں کیا کرتی تھی۔

اسی طرح سفر کرتے کرتے کئی دن گذر گئے ایک روز وہ لوگ اونچے اونچے پہاڑوں کے دامن میں چل رہے تھے۔ سردی اتنی سخت تھی کہ دن کے وقت بھی وہاں برف جمی ہوئی تھی۔ وہ لوگ بھوک اور تھکن کی وجہ سے بہت کم زور ہو گئے تھے۔ اُن کی گائے بھی بہت کم زور ہو چکی تھی۔ جس جگہ وہ چل رہے تھے وہاں اُونچی نیچی چٹانیں تھیں اور ڈھلوان بھی تھا۔ ایک جگہ ان کی کم زور گائے کا پیر پھسل گیا اور وہ گر پڑی۔ جان نے ایک چیخ سنی تو وہ پیچھے پلٹا۔ کیا دیکھتا ہے کہ اُس کی سب سے بڑی بہن گائے کے نیچے دبی ہوئی ہے۔

"ہائے میرا پیر...... ہائے میرا پیر..."

اس کی بہن درد سے چیخ رہی تھی۔

جان اور اُس کے بھائی نے کچھ گائے کو دھکیلا اور کچھ اپنی بہن کو باہر کھینچنے کی کوشش کی۔ اس طرح آخر کار وہ گائے کو کھڑا کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

"ارے میرا پیر ٹوٹ گیا.....!" جان کی بہن نے روتے ہوئے کہا۔

"میری بہن تم آرام سے لیٹ جاؤ میں اسے ابھی ٹھیک کر دوں گا۔ بالکل اُسی طرح سے جیسے ماں نے مجھے بتایا تھا۔" جان نے کہا۔

پھر جان نے جنگل سے دو سوکھی ہوئی سیدھی لکڑیاں تلاش کیں اور انھیں کمبل پھاڑ کر اپنی بہن کے پیر سے باندھ دیا، تاکہ اس کا پیر بالکل سیدھا رہے۔ آخر میں اپنے دوسرے بھائی کی مدد سے اُس نے اپنی بہن کو گائے پر بٹھا دیا۔ اُس کے سامنے اُس نے اپنی دوسری بہن کو بٹھا دیا، تاکہ وہ بڑی بہن کے پیر کو پکڑے رہے جس سے اس کا پیر سیدھا ہی رہے اور تکلیف نہ ہونے پائے۔ اُس کی بہن نے اب رونا تو بند کر دیا تھا، لیکن درد کی وجہ سے بار بار اپنے ہونٹ چبا رہی تھی۔

ان بچوں کے پیر سردی کی وجہ سے بالکل جم سے گئے تھے۔ ننگے پیر چلنے کی وجہ سے پیروں میں زخم پڑ گئے تھے اور چوں کہ کئی دن سے وہ لوگ نہائے

بھی نہ تھے، اس لیے میل کی وجہ سے اُن کے بدن پر بھی زخم پڑ گئے تھے۔ رات کے وقت وہ لوگ کسی درخت کے نیچے یا کسی چٹان کی آڑ میں لیٹ جاتے۔ اس وقت جان چھوٹے بچوں کو بالکل پیچھے کی طرف رکھتا، تاکہ وہ لوگ گرم رہیں اور سردی کا ان پر اثر نہ ہو۔ چھوٹا بچہ تو بہت ہی زیادہ بیمار ہو گیا تھا۔ وہ ہر وقت بے ہوش ہی رہتا۔ کبھی کبھی تو جان کو ایسا معلوم ہوتا کہ اس کا ننھا منا بھائی سانس بھی نہیں لے رہا ہے۔

اتنی تمام مصیبتیں اٹھانے کے بعد وہ لوگ آخر کار اُس جگہ پہنچ ہی گئے، جہاں سے سامنے ہی انھیں ایک پہاڑی پر ایک چھوٹا سا مکان نظر آ رہا تھا۔ یہی وہ مکان تھا جس میں ڈاکٹر وہٹ مین رہتا تھا۔ اس پہاڑی پر صنوبر کے درختوں تلے ڈاکٹر نے تختوں کا چھوٹا سا مکان بنا رکھا تھا۔ پہاڑی پر چڑھتے وقت گائے ان کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ اس چڑھائی پر چلنا اس کے لیے بہت مشکل تھا، اس لیے بار بار کھنچی جاتی۔ اُس کی پیٹھ پر جان کی دونوں بہنیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ بڑی بہن کا پیر ابھی تک بندھا ہوا تھا۔ اُن کے بال اُلجھے ہوئے اور میلے تھے۔ جان کے بھائی کی پتلون پھٹی ہوئی تھی اور وہ گائے کے برابر چل رہا تھا۔ اُن کے پیر سردی اور پہاڑوں پر ننگے پیر چلنے کی وجہ سے پھٹ گئے تھے اور اُن سے خون بہہ رہا تھا۔ بہرحال گرتے پڑتے ٹھوکریں کھاتے وہ کسی نہ کسی طرح پہاڑی پر چڑھ ہی گئے۔

ابھی جان دروازے کے سامنے پہنچا ہی تھا کہ ڈاکٹر وہٹ مین اور اُس کی بیوی دونوں اندر سے نکلے۔ دونوں کو دیکھ کر جان کی رہی سہی ہمت جاتی رہی اور وہ ایک دم زمین پر گھٹنوں کے بل گر گیا، پھر ایک ایک کر کے تمام بچے زمین پر بیٹھ گئے لیکن بے چاری گائے کھڑی ہی رہی۔ ڈاکٹر کی بیوی نے جان کی گود سے بچے کو لے لیا اور اندر لے جا کر اسے نہلایا دھلایا۔ ڈاکٹر وہٹ مین دوسرے بچوں کی دیکھ بھال کرتا رہا اور جان اپنے بھائی کو نہلانے کے لیے ڈاکٹر کی بیوی کے پاس ہی رہا۔ نہلانے کے بعد ڈاکٹر کی بیوی نے بچے کے منھ میں گرم گرم دودھ ٹپکایا، جس سے اس کو کچھ ہوش آیا۔

تمام رات وہ لوگ اس بچے کی دیکھ بھال کرتے رہے۔ دوسرے بچوں کے لیے علیحدہ علیحدہ بستر بچھا دیے گئے تھے۔ صبح ہوئی تو ڈاکٹر نے جان سے تمام واقعات پوچھنے کے بعد کہا کہ وہ اُن بچوں کو پالنا چاہتا ہے، اس لیے وہ سب لوگ اسی کے پاس رہیں۔

جان چوں کہ اب کولمبیا کے زرخیز علاقے میں پہنچ چکا تھا، اس لیے اُس نے ڈاکٹر کی بات مان لی۔ اس طرح ان ننھے منے بچوں کا سفر ختم ہو گیا۔ پھر جب جان نے بڑا ہو کر اپنی کھیتی باڑی شروع کی تو اس کے باپ کی خواہش بھی پوری ہو گئی، کیوں کہ بہت ہی جلد یہ علاقہ امریکی ریاست میں شامل ہو چکا تھا۔ اس طرح جو کام اس کا باپ پورا نہ کر سکا تھا وہ جان نے پورا کر دیا۔



عقل کی کرامت

اشرف صبوحی

سندھ کے میدانوں میں ایک مسافر کا اونٹ کہیں بھٹک گیا۔ بے چارہ حیران پریشان کبھی اِدھر دوڑتا کبھی اُدھر، مگر اونٹ کا کھوج نہ لگتا۔ سامنے سے ایک فقیر آتا ہوا دکھائی دیا۔ مسافر نے دوڑ کر اس سے پوچھا، "سائیں، تم نے راستے

میں کوئی اونٹ تو نہیں دیکھا؟" فقیر بولا، "بابا کیا تم سو گئے تھے؟"

مسافر: ہاں سائیں، ذرا کی ذرا آنکھ لگ گئی تھی۔

فقیر: تمھارا اونٹ کانا ہے؟

مسافر: جی شاہ صاحب، اس کی ایک آنکھ پھوٹی ہوئی ہے۔

فقیر: اور وہ پچھلی ایک ٹانگ سے لنگڑا بھی ہے؟

مسافر: دو چار دن سے واقعی وہ چاروں پاؤں ٹکا کر نہیں چل سکتا۔

فقیر: ایک طرف اس پر گیہوں لدے ہوئے ہیں اور دوسری طرف آٹا۔ کیوں؟

مسافر: بالکل ٹھیک، وہ میرا ہی اونٹ ہے۔ آپ کو کہاں ملا تھا؟

فقیر: مجھے تو بابا وہ کہیں ملا نہیں۔ ہاں، اتنا جانتا ہوں کہ وہ پورب کی طرف گیا ہے، ڈھونڈو شاید مل جائے۔

مسافر: سائیں جی اللہ والے ہو کر ایسی باتیں کرتے ہو۔ میں تمھاری منّت کرتا ہوں ٹھیک پتہ بتا دو۔

فقیر: بابا میرے گلے کیوں پڑتا ہے۔ میں نے تیرے اونٹ کو دیکھا تک نہیں۔

مسافر: (بگڑ کر) دیکھا تک نہیں تو یہ ساری نشانیاں کیسے جان لیں۔ سیدھی طرح سے بتا دو۔ گیہوں کے بورے میں سو روپے کی تھیلی بھی تھی۔

فقیر: بابا ہو گی میں کیا جانوں۔

اتنے میں دو چار مسافر اور آ گئے۔ جس نے سنا فقیر کی نیت کھوٹی بتائی اور کہنے لگے کہ اسے پکڑ کر شہر لے چلو کوتوال اپنے آپ پوچھ لے گا۔

مسافر: سائیں جی بتاتے ہو یا تمھیں کوتوال کے پاس لے چلیں؟

فقیر: بابا جو تمھارا جی چاہے کرو۔ میں سچ کہتا ہوں میں نے تمھارا اونٹ نہیں دیکھا۔

دوسرے مسافر: سائیں جی! کیوں اپنی مٹّی خراب کراتے ہو۔ بھلا جب تم نے اونٹ کو دیکھا نہیں تو یہ سب کیسے جان لیا کہ وہ کانا، لنگڑا تھا اور اس کے ایک طرف گیہوں لدے ہوئے تھے اور دوسری طرف آٹا اور وہ اکیلا بھی تھا۔ تم ایسے اللہ کے ولی تو نظر نہیں آتے کہ تمھیں

آپ ہی آپ یہ ساری باتیں معلوم ہو گئیں۔

فقیر نے جب دیکھا کہ سارے مسافر سر ہی ہو گئے تو کہنے لگے، "بابا، یہ سارے سمجھ بوجھ کے کھیل ہیں۔ میں نے ایک جگہ دیکھا کہ اونٹ کے کھڑے ہونے اور آدمی کے لیٹنے کا نشان ہے۔ میں سمجھا کہ یہاں کوئی اونٹ والا سو گیا ہے۔ آگے چل کر میں نے خالی اونٹ کے پاؤں دیکھے۔ معلوم ہوا کہ اونٹ بھٹک گیا ہے۔ راستے میں دونوں طرف ببول کے درخت تھے، لیکن صرف ایک طرف منھ مارا ہوا دکھائی دیا۔ میں نے سمجھ لیا کہ اونٹ کی ایک آنکھ نہیں ہے، پھر اونٹ کے پاؤں کے نشان نظر آئے۔ پچھلے پاؤں کے نشانوں میں ایک ہلکا تھا۔ میں نے جان لیا کہ اس کی ایک ٹانگ چوٹ کھائی ہوئی ہے۔ تھوڑی دور چل کر بائیں ہاتھ پر چیونٹیاں دیکھیں کہ آٹے کے بھورے لیے جاتی ہیں اور دائیں ہاتھ پر چڑیاں گیہوں کے دانے چگ رہی تھیں۔ جنگل میں آٹا اور گیہوں بکھیرنے والا کون آیا۔ میری عقل نے کہا کہ ہو نہ ہو جو اونٹ کانٹرا بھی ہے، لنگڑا بھی ہے اور اپنے مالک سے بچھڑ گیا ہے، اس پر ضرور یہ دونوں چیزیں لدی ہوں گی۔ اب تم چاہے جو کچھ کہو میں نے جو کچھ دیکھا تھا بتا دیا۔ میں چور نہیں ہوں معمولی فقیر ہوں۔ اگر میں اٹھائی گیرا ہوتا یا غیب کا حال جاننے والا، تو اس طرح بھیک نہ مانگتا پھرتا! ہاں میرے خدا نے مجھے تھوڑی سمجھ دی ہے۔

فقیر کی یہ باتیں سن کر جتنے دوسرے مسافر تھے، سب اس کی سمجھ داری کے قائل ہو گئے اور جس مسافر کا اونٹ کھویا گیا تھا، اس سے بولے، "بھائی غریب سائیں کے پیچھے نہ پڑو۔ اس پر الزام لگانا ٹھیک نہیں۔ تمھارا اونٹ یہیں کہیں ہو گا۔ جدھر سائیں جی بتاتے ہیں، لپکے ہوئے چلے جاؤ۔ کوس دو کوس ورے پرے ضرور مل جائے گا۔"

چناں چہ سب نے اپنا اپنا راستہ لیا اور اونٹ والا مسافر فقیر کے بتائے ہوئے کھوج پر چلا۔

تھوڑی دیر کی دوڑ دھوپ کے بعد جدھر فقیر نے کہا تھا، اونٹ بھی مل گیا۔

باربار پڑھنے کے قابل



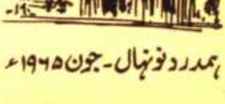
پہیلی

مولوی محمد اسماعیل میرٹھی

جیواں ہے وہ نہ انساں جن ہے نہ وہ پری ہے — سینے میں اُس کے ہر دم اِک آگ سی بھری ہے
کھا پی کے آگ پانی، چنگھاڑ مارتی ہے — سر سے دُھواں اُڑا کر غصّہ اُتارتی ہے
وہ گھورتی گرجتی بھرتی ہے اِک سپاٹا — ہفتوں کی منزلوں کو گھنٹوں میں اُس نے کاٹا
آتی ہے شور کرتی جاتی ہے غُل مچاتی — وہ اپنے خادموں کو ہے دُور سے جگاتی
بے خوف بے محابا ہر دم رواں دواں ہے — ہاتھی بھی اس کے آگے اِک مورِ ناتواں ہے
آندھی ہو یا اندھیرا ہے اُس کو سب برابر — یکساں ہے نور و ظلمت اور روز و شب برابر
اُتّر سے لے دکن تک پورب سے لے پچھاں تک — سب ایک کر دیا ہے پہنچی ہے یہ جہاں تک
ہر آن ہے سفر میں، کم ہے قیام کرتی — رہتی نہیں معطّل پھرتی ہے کام کرتی
پردیسیوں کو جھٹ پٹ پہنچا گئی وطن میں — ڈالی ہے جان اُس نے سوداگری کے تن میں
ہر چیز سے نرالی ہے چال ڈھال اس کی — پاؤ گے صنعتوں میں کم تر مثال اُس کی
برکت سے اُس کی بے پر پردار بن گئے ہیں — مُلک اس کے دَم قدم سے گلزار بن گئے ہیں
ہم کہہ چکے مفصّل، جو کچھ ہے کام اُس کا — جب جانیں تم بتا دو، بن سوچے نام اس کا



جی ہاں سمجھ گیا میں، پہلے ہی میں نے تاڑی
وہ دیکھو! آگرے سے آتی ہے ریل گاڑی





فرانسیسی بغلول کے کارنامے

فہمیدہ اختر

فرانس میں ایک قصبہ تھا۔ پُرانے زمانے میں وہاں ایک آدمی رہا کرتا تھا۔ اس کے بیوی بچے اس آدمی کی بے وقوفی سے بہت تنگ تھے۔ وہ اپنے آپ کو بے حد عقل مند سمجھتا تھا، مگر اس قدر بے وقوف تھا کہ ہر کام اُلٹا کرتا۔ تم نے کہانیوں میں شیخ چلّی کا نام تو ضرور سنا ہوگا اور ان کے عجیب عجیب کارنامے اور مزے دار باتیں پڑھ کر یا سن کر خوب ہنسے ہوگے۔ بس اس آدمی کے سارے کام اور باتیں کچھ اسی طرح کی تھیں، جیسے شیخ چلّی کی۔ اس کا نام جو کچھ بھی تھا، مگر ہم اسے مسٹر بغلول کہتے ہیں۔

تو اب ان مسٹر بغلول کی دل چسپ باتیں اور بے وقوفیوں کے مزے دار کارنامے ہم تمھیں سُناتے ہیں۔

مسٹر بغلول کا گدھا اور بلّی

ایک مرتبہ مسٹر بغلول نے ایک گدھا پالا۔ وہ رات دن اسے خوب کھلاتے پلاتے اور اس کی دیکھ بھال کرتے۔ گدھا بہت موٹا تازہ ہو گیا۔ کسی کام سے ایک بار مسٹر بغلول کو اپنے گاؤں سے دور کسی اور گاؤں کو جانا پڑا۔ وہ اپنے گدھے پر سوار ہو کر سفر کو چل پڑے۔ چلتے چلتے راستے میں تھک کر

ایک جگہ ٹھہرے۔ اب انھوں نے اِدھر اُدھر دیکھا کہ گدھے کو کہیں سے گھاس کھلائیں اور پانی پلائیں، مگر وہ ایسی جگہ تھی کہ نہ کہیں گھاس کا ایک تنکا نظر آیا اور نہ پانی ہی دکھائی دیا۔ مسٹر بغلول نے سوچا میں ذرا دیر یہاں سُستالوں اس کے بعد آگے جاکر گدھے کو گھاس تلاش کر کے کھلادوں گا۔

ان کو لیٹتے ہی نیند آگئی۔ جب کچھ دیر بعد آنکھ کھلی تو وہاں اُن کا گدھا موجود نہ تھا۔ سمجھے کہیں وہ خود ہی گھاس تلاش کرنے چلا گیا ہوگا۔ ابھی آجائے گا، مگر گدھا دیر تک نہ آیا۔ اب انھیں فکر ہوئی اور گھوم پھر کر اسے ڈھونڈھنے لگے۔ گدھا کہیں بھی نظر نہ آیا۔ مسٹر بغلول نے دل میں سوچا ”میں بھی کتنا بُرا آدمی ہوں۔ اس بے زبان جانور کے کھانے پینے کی پہلے سے فکر نہ کی۔ جیسے اپنے لیے کھانا لے کر آیا تھا اس کے لیے بھی گھاس کا ایک گٹھا سا ساتھ لے آتا۔ گدھا مجھ سے روٹھ کے چلا گیا۔“ بڑی دیر تک وہ اپنے آپ کو بُرا بھلا کہتے رہے اور گدھے کا نام لے کر جگہ جگہ پکارتے پھرے، مگر گدھا نہ ملنا تھا نہ مِلا۔ آخر مسٹر بغلول نے دُعا مانگی کہ ”خدایا میرا گدھا مل جائے۔“ اور پھر اسے تلاش کرنے لگے۔ راستے بھر دُعا مانگتے جاتے اور کہتے جاتے:

”اگر میرا گدھا مل گیا تو میں اسے ایک رپے میں بیچ ڈالوں گا۔“

اسی طرح گدھے کو تلاش کرتے آگے جانے کے بجائے لوٹ کر سیدھے گھر پہنچ گئے۔ ان کی بیوی نے پوچھا، خیر ہے تم تو سفر پر گئے تھے، اتنی جلد گھر کیوں آگئے؟ اور گدھا کہاں ہے؟“ مسٹر بغلول نے بیوی کو ساری کہانی سنائی اور کہا کہ میں نے اپنے گدھے کی اچھی طرح دیکھ بھال نہ کی، اس لیے وہ چلا گیا۔ اب میں نے منّت مانی ہے کہ جب بھی گدھا مل جائے گا میں اسے اپنے پاس نہیں رکھوں گا، بلکہ فوراً ایک رُپے میں بیچ ڈالوں گا۔

بیوی نے کہا، ”ٹھیک ہے۔ جب تم گدھا بیچنے بازار جاؤ گے تو میری بلّی کو بھی لے جانا وہ بھی ایک دفعہ کھو گئی تھی۔ اس وقت میں نے بھی منّت مانی تھی کہ جب وہ ملے گی تو اسے بیچ ڈالوں گی۔“ مسٹر بغلول نے کہا، ”ٹھیک ہے میں اسے بھی بیچ دوں گا، مگر تم نے اس کی کیا قیمت مانی تھی؟“

بیوی نے کہا، ”میں نے منّت مانی تھی کہ میں اپنی بلّی کو ایک ہزار رُپے میں بیچوں گی۔“

مسٹر بغلول نے بیوی کی بات مان لی اور گدھے کے ملنے کا انتظار کرنے لگے۔ آخر

ایک دن کوئی شخص ان کے گدھے کو پکڑ کرلے آیا کہ کہیں جنگل میں گھاس کھاتا پھر رہا تھا۔ مسٹر بغلول بہت خوش ہوئے اور اپنی منّت پوری کرنے کے لیے فوراً گدھے کو لے کر بازار جانے لگے کہ بیچ ڈالیں۔ ان کی بیوی نے جھٹ بلّی اُٹھا کر ان کی گود میں دے دی کہ اسے بھی بیچ دو تو میری منّت بھی پوری ہو جائے۔

مسٹر بغلول بازار پہنچے اور چلّا کر کہنے لگے:

"ایک عمدہ گدھا بکاؤ ہے۔ جو کوئی گدھا خریدے تو آجائے۔"

اِدھر اُدھر سے لوگ آکر ان کے چاروں طرف جمع ہو گئے اور گدھے کی قیمت پوچھنے لگے مسٹر بغلول نے کہا، "گدھے کی قیمت ایک رُپیہ ہے۔" ہر شخص خریدنے کو خوشی خوشی جھپٹ پڑا۔ اب مسٹر بغلول نے کہا، "یہ گدھا اس شخص کے ہاتھ بیچوں گا، جو اس کے ساتھ یہ بلّی بھی خریدے گا۔" لوگوں نے پوچھا "بلّی کی کیا قیمت ہے؟" انھوں نے کہا، "ایک ہزار رُپے!" سارے لوگوں نے چلّانا شروع کیا، "یہ کیا پاگل پن ہے۔ گدھے کی قیمت ایک رپیہ اور اس بڈھی بیمار سی بلّی کی قیمت ایک ہزار رُپے!" مگر مسٹر بغلول اپنی بات پر اڑے رہے کہ جو شخص گدھا خریدے گا اسے ایک ہزار رُپے میں بلّی بھی خریدنا ہو گی، کیوں کہ ان کی بیوی کی شرط یہی ہے۔" سارے لوگ مسٹر بغلول کو بُرا بھلا کہتے وہاں سے چلے گئے اور وہ بے چارے آواز لگاتے رہ گئے:

"ایک گدھا بکاؤ ہے ایک رُپے میں،
ایک بلّی بکاؤ ہے ایک ہزار رُپے میں!"

اور لوگ ان کی بے وقوفی پر ہنستے ہوئے گزرتے چلے گئے۔ وہ سب سمجھتے تھے کہ مسٹر بغلول ہم سے دل لگی کر رہے ہیں۔

در اصل ان کی بیوی اتنی ہی عقل مند تھی، جتنے وہ بے وقوف تھے۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ گدھا بیچیں، اس لیے اس نے اپنی منّت کی شرط لگائی، کیوں کہ وہ خوب سمجھتی تھی کہ کوئی شخص بھی اس بلّی کو ایک ہزار رُپے میں نہیں خریدے گا اور اس طرح گدھا بھی نہیں بک سکے گا۔

بیمار بکری کو تیل پلایا

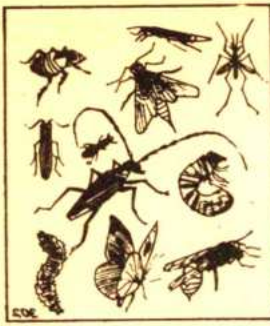
مسٹر بغلول نے ایک دفعہ بکری پالی ان کے ایک پڑوسی نے بھی بکری پالی۔ کچھ دنوں بعد پڑوسی کی بکری بیمار ہو گئی۔ اس نے مسٹر بغلول سے آکر پوچھا، "میری بکری بیمار ہے۔ اس کو کیا دوا دوں۔"

بغلول نے کہا، "میری بکری بیمار ہوئی تھی تو میں نے اس کو مٹی کا تیل پلایا تھا۔" پڑوسی نے پوچھا، "کتنا تیل پلایا تھا؟" بغلول نے کہا، "ایک پیالہ صبح اور ایک پیالہ شام کو۔"

پڑوسی نے اپنے گھر آ کر بکری کو ایک پیالہ بھر کے تیل پلایا۔ شام سے پہلے اس کی بکری مر گئی۔ وہ چیختا چلّاتا مسٹر بغلول کے پاس آیا اور کہنے لگا، "تم نے تیل پلوا کر میری بکری کو مروا دیا۔" بغلول نے کہا، "میں کیوں مرواتا میں نے کب کہا تھا کہ تم اپنی بکری کو تیل پلاؤ۔ تم نے تو مجھ سے میری بکری کا پوچھا تھا کہ اسے بیماری میں کیا دوا دی تھی اور میں نے تم سے کہہ دیا تھا کہ "مٹی کا تیل پلایا تھا۔" پڑوسی نے کہا،

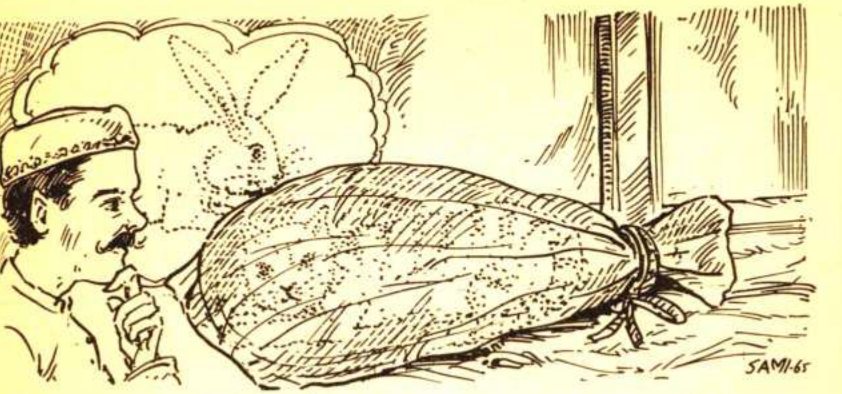
"پھر تیل پی کر تمھاری بکری کیسے اچھی ہو گئی تھی؟" مسٹر بغلول نے اطمینان سے جواب دیا، "میں نے یہ کب کہا تھا کہ میری بکری تیل پی کر اچھی ہو گئی تھی۔ وہ تو مر گئی تھی۔ تم مجھ سے پوچھتے کہ اچھی ہو گئی یا مر گئی؟ تو میں تمھیں سب کچھ بتاتا۔"

یہ سن کر پڑوسی مسٹر بغلول کو برا بھلا کہتا وہاں سے چلا گیا۔



کیڑے مکوڑے اور ان کی خوراک

صرف کیڑے مکوڑوں کی تعداد دنیا کے کل جان داروں کی تعداد کا ۴/۵ حصہ ہے اور زمین پر کیڑوں کی تقریباً ۸ لاکھ اقسام پائی جاتی ہیں۔ ان تمام کیڑوں مکوڑوں کو ختم کرنا آدمی کے بس کی بات نہیں اور یہ کیڑے ہر اس چیز کو جسے آدمی اگاتا اور جمع کرتا ہے تباہ کرتے ہیں۔ اس طرح دنیا کی کل خوراک کا ایک تہائی حصہ ضائع ہوتا ہے کچھ کیڑے آدمی کے لیے مفید ہیں، چناں چہ ہم نقصان پہنچانے والے کیڑوں کو مارنے کے بجائے فائدہ پہونچانے والے کیڑوں کی دیکھ بھال پر زیادہ توجہ دیتے ہیں، جیسے ریشم کا کیڑا اور شہد کی مکھی۔



خرگوش اور بلّی

آسمہ عمر

کسی گاؤں میں ایک زمیندار رہتا تھا۔ اس کی کوئی اولاد نہ تھی۔ اُسے جانوروں سے بہت محبّت تھی۔ اس کے پاس بہت سے جانور تھے، جن کا وہ بہت خیال رکھتا تھا۔ ایک دن اس کا ایک دوست آیا اور جانوروں کو دیکھ کر کہنے لگا کہ "دوست اس میں سے مجھے ایک لال خرگوش چاہیے، میں اسے اپنے بیٹے کے لیے لے جاؤں گا، اُسے خرگوش بہت پسند ہیں۔" زمیندار نے کہا، "شوق سے لے جائیے۔" دوست نے کہا، "میں اپنے ملازم کو کل بھیج دوں گا۔" دوسرے دن اُس نے اپنے ملازم کو زمیندار کے پاس بھیجا۔ زمیندار نے خرگوش پکڑ کر تھیلی میں ڈال دیا۔ پہلے تو خرگوش بہت اُچھلا کودا، پھر خاموش تھیلی میں بیٹھ رہا۔ ملازم اُسے لے کر اپنے مالک کے گھر روانہ ہوگیا، جو زمیندار کے گھر سے چھ کوس دور تھا۔ راستے میں ملازم کو پیاس اور بھوک لگی تو وہ ایک سرائے کے پاس ٹھہرا۔ تھیلی سرائے کے پاس رکھ کر وہ پانی پینے کنوئیں کے پاس گیا۔ جب سرائے والے نے تھیلی کے اندر کوئی چیز ہلتی ہوئی دیکھی اور اس کو کھول کر دیکھا تو اندر خرگوش تھا۔

اُس نے سوچا کہ اس آدمی سے مذاق کرنا چاہیے، یہ سوچ کر اُس نے تھیلی کو اٹھایا اور اس میں سے خرگوش کو نکال کر اپنی بلّی اس میں ڈال دی، پہلے تو بلّی بہت کچھ اچھلی کودی، پھر خاموش ہوگئی۔ ملازم پانی پی کر آیا اور تھیلی کو اٹھا کر کندھے پر ڈال کر گھر روانہ ہوگیا اور شام تک منزل پر پہنچ گیا۔ اُس نے مالک سے کہا کہ "خرگوش لایا ہوں۔" یہ کہہ کر ملازم نے تھیلی کھولی، مگر اُس کے اندر بلّی کو دیکھ کر وہ ہکّا بکّا رہ گیا، مالک بہت بگڑا، پہلے تو سوچا، شاید دوست نے مذاق کیا ہوگا، مگر اُس کو خیال ہوا کہ یہ شرارت ملازم کی ہے اور وہ خفا ہوکر ملازم سے کہنے لگا، "نکل جاؤ تم میرے سامنے سے۔" ملازم بہت شرمندہ ہوکر واپس ہوا اور دل ہی دل میں خیال کرنے لگا کیا لایا تھا اور نکلا کیا! واپس پھر اسی راستے سے ہوا۔ رات ہوگئی تھی سوچا کہ اسی ہی سرائے میں ٹھہر جاؤں، صبح سویرے نکل جاؤں گا۔ اب تھیلی سرہانے رکھ کر وہ سستانے لگا اور چند منٹ میں گہری نیند سوگیا۔ سرائے والا بات تاڑ گیا۔ اب اس نے تھیلی کو پھر کھولا اور اس کا خرگوش اُس میں بند کر کے اپنی بلّی نکال لی!

ملازم صبح سویرے اٹھا اور اُس نے اپنا راستہ لیا اور راستے بھر جھنجھلاتا ہوا کہتا رہا کہ ان کے مذاق کی وجہ سے میں مالک کی باتیں سُن چکا۔ اس کو یہ بھی خیال تھا کہ خرگوش خود اس نے اپنے ہاتھ سے بند کیا، مگر وہ بلّی کس طرح ہوگیا۔ دروازہ میں داخل ہوا تھا کہ زمیندار سامنے آگیا اُس نے پوچھا کہ دوست نے خرگوش نہیں لیا؟ اول تو وہ سوچنے لگا کہ کیا کہے، پھر بولا واہ سرکار آپ نے بلّی بند کرادی اس میں، اور مجھ سے کہا خرگوش ہے۔ آپ کے دوست بلّی کو دیکھ کر مجھ غریب پر برس پڑے۔

زمیندار حیران تھا کہ یہ کیا بکتا ہے۔ جب ملازم نے تھیلی میں ہاتھ ڈالا کر بلّی کو نکالنا چاہا تو اس کے ہاتھ میں دو بڑے بڑے کان آگئے اور اس نے جب دیکھا کہ اس کے اندر خرگوش ہے تو بولا، "واہ سرکار! خوب ہے آپ کا یہ خرگوش۔ اُدھر جاتا ہے تو بلّی اِدھر آتا ہے تو خرگوش۔

★

سکّے کی کہانی خود اُس کی زبانی

سعدی سنگروری

ہم جب کبھی اپنی ضرورت کی چیزیں خریدنے کے لیے بازار جاتے ہیں اور کسی دکان دار سے چیزیں لیتے ہیں تو اس کے بدلے میں اُسے دام دیتے ہیں اور پھر چیزیں لے کر گھر چلے آتے ہیں، مثلاً ہم نے کسی دکان دار سے پھل۔ کپڑا، ریڈیو یا ربڑ کی کوئی معمولی سی گیند خریدی تو اس کی جو قیمت ہوگی، وہ ہمیں ادا کرنی پڑے گی۔ جیسے کیلے یا سنگترے کی قیمت ہے، ایک آنہ یا دو آنے، ریڈیو کی قیمت ہے، پانچ رُپے یا ایک ہزار۔

بھلا قیمت کیا چیز ہے؟ یہ ایک طرح سے کسی چیز کا بدلہ ہے یا یوں سمجھو کہ آپس میں لین دین اور خرید و فروخت کا ایک طریقہ ہے، جو ہزاروں سال پہلے سے چلا آرہا ہے۔ آج ہمارے زمانے میں تو رپے، پیسے، اٹھنّی چوَنّی اور دوَنّی وغیرہ سکّوں سے یا کاغذ کے نوٹوں سے کسی شے کے لینے دینے کا بدلہ یا قیمت چکائی جاتی ہے، لیکن پہلے پہل جب اِنسان تاجر بنا اور آپس میں لین دین اور ایک دوسرے کے ہاتھ چیزوں کے بیچنے اور لینے دینے کا سلسلہ چلا، اس وقت کاغذ کے رنگ برنگے نوٹ اور مختلف دھاتوں کے مختلف چھوٹے بڑے سِکّے نہیں تھے بلکہ قاعدہ یوں تھا اگر کسی کو مثال کے طور پر بھیڑ کی ضرورت ہے تو وہ اس کے بدلے میں بھیڑ کے مالک کو اناج پیش کرتا یا اگر کسی کو چاقو کی ضرورت پڑی تو اس نے اس کے بدلے پھولوں سے بھرا ہوا ایک تھیلا لاکر پیش کر دیا۔ لیکن اس طریقے میں ایک بہت بڑی دشواری یہ پیش آتی تھی کہ اکثر اوقات ایک دوسرے کی مطلوبہ چیزیں آسانی سے مہیا نہیں ہو سکتی تھیں، اس لیے "کچھ دو اور کچھ لو" کا یہ اصول

کہ جس پر اُن دنوں تجارت چل رہی تھی، کچھ زیادہ آسان ثابت نہیں ہوا۔ عام طور پر یوں ہوتا کہ کسی چیز کے خریدنے اور بیچنے والے دونوں اپنی اپنی ضرورتوں کے پورا کرنے کے لیے مطلوبہ چیزوں کے مہیا نہ ہونے سے ایک دوسرے کا مُنھ دیکھتے رہ جاتے اور ضرورتیں اپنی جگہ قائم رہتیں۔

کہتے ہیں ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ پس انسان نے خرید و فروخت اور لین دین کے مسئلے حل کرنے اور دشواری کو آسان بنانے کے لیے ایک ایسی شے کو "بدلہ، قیمت یا زر مبادلہ" قرار دیا، جسے ایک دوسرے کو لیا دیا جاسکے اور اس کے ایک جگہ سے دوسری جگہ تک اٹھاکے لے جانے میں آسانی رہے، علاوہ ازیں تجارت کے دوران آپس میں تقسیم بھی کر سکیں۔

اوّل اوّل مختلف اوقات اور مختلف ملکوں میں ہر قوم میں جُدا جُدا چیزیں قیمت یا زر مبادلہ کا کام دیتی تھیں، مثلاً کانگو، سیکنڈ نیویا، جزائر فجی اور میکسیکو وغیرہ میں کوکا کے بیج اور کوڑیاں وغیرہ چلتی تھیں، لیکن یہ چیزیں بھی کچھ زیادہ مفید ثابت نہ ہوسکیں۔ انسان جو مسلسل اس کوشش میں تھا کہ وہ کوئی ایسی شے ڈھونڈ نکالے، جو تجارت کے ذریعے کو آسان کر سکے، بالآخر مختلف دھاتوں کے سکے بناکر چلانے میں کامیاب ہوگیا۔

یونان اور مصر میں پہلے پہل تانبے کے چھلّے اور چاندی کی سلاخیں چلیں۔ تجارت کی منڈیوں میں ان ہی چیزوں سے لین دین ہوتا تھا۔ بابل، یونان اور مصر کے تاجروں کا عام طور پر دستور یہ تھا کہ تانبے اور چاندی کے چھلّوں اور سلاخوں پر ان کا وزن اور مالیت کندہ کراتے اور اشیا کی جو قیمت طے ہوتی، اُسی اعتبار سے چھلّے اور سلاخیں قیمت کے طور پر ادا کر دیے جاتے، مگر آگے چل کر جب شخصی بادشاہت کا زمانہ شروع ہوا تو قدیم بادشاہوں نے تاجروں کی اسی مثال کو سامنے رکھتے ہوئے مختلف دھاتوں کو پگھلاکے مختلف وزن اور مالیت کے چھوٹے بڑے اور گول مٹول غرض مختلف

شکلوں کے سکّے بنانے کا رواج قائم کیا۔ وہ سکّے جو بادشاہوں کی طرف سے چلائے گئے، اُن کے ایک طرف وقت کے بادشاہ کی تصویر کندہ ہوتی تھی اور دوسری طرف سکّے کا وزن اور اس کی مالیت، تاکہ لوگ اس پر اعتماد کرکے آپس میں لین دین اور تجارت کا سلسلہ قائم کرسکیں، نیز جس کسی کو جو شے درکار ہو، اُسے ان سکّوں کے ذریعے فوراً مِل جائے۔

مختلف دھاتوں کے مختلف سکّے جو آج ہمارے زمانے میں چل رہے ہیں، یہ وہی ہیں جن کا اوپر ہم ذکر کرچکے ہیں۔ نئے زمانے میں ان سکّوں کے علاوہ جو نئی شے ایجاد یا قائم ہوئی وہ کاغذ کے نوٹ ہیں۔ کہتے ہیں پُرانے زمانے کے لوگ اکثر اپنے روپے پیسے کو شہر کے سُنار کے پاس امانت کے طور پر رکھوا دیتے تھے اور وہ انھیں اپنی تجوریوں میں محفوظ کرلیتا اور اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک تحریر بطور رسید اُن کے حوالے کردیتا۔

سُنار کی رسید کو لوگ اتنی قیمتی اور قابلِ اعتبار سمجھتے تھے کہ گویا اُن کے نزدیک ایک طرح سے یہ نقد رقم ہے، یعنی یہ رسید اتنی ہی اہمیت رکھتی تھی جتنا کہ رُپیہ خود، اسی لیے وہ لوگ رسید کے ذریعے اکثر لین دین اور تجارت کرتے اور بسا اوقات ایک دوسرے کو ادھار بھی دے دیتے۔

ایک عرصے تک جب سنار کے ہاتھ کی لکھی ہوئی رسید رُپے کی جگہ کام دیتی رہی تو لوگوں کے ذہن میں آپ سے آپ یہ بات بھی پیدا ہوگئی کہ جو کام وہ مختلف دھاتوں کے سکّے بناکر لیتے ہیں، کیوں نہ وہی کام کاغذ کے مختلف سکّے بناکر نہ لیں۔ کاغذ کے یہ رنگ برنگے اور مختلف مالیتوں کے یہ نوٹ جو آج ہمارے زمانے میں سکّے کے طور پر چل رہے ہیں، پُرانے زمانے ہی کی یادگار ہیں۔ ان کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ انسان سکّوں کا وزن اٹھانے سے بچ گیا حتیٰ کہ کئی کئی ہزار رُپے کاغذ کے نوٹ کی شکل میں ہر انسان اپنی جیب میں بآسانی رکھ سکتا ہے۔ برعکس اس کے مختلف دھاتوں کے سکّے کے ایک ہزار کی رقم اٹھانا کتنا مشکل ہے۔



بی بلّی سارا مکھن کھا گئیں!

نگار یاسمین

یہ کہانی جو آج ہم تمھیں سُنا رہے ہیں، بہت پُرانی ہے۔ اتنی پُرانی کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ اس وقت شاید تمھاری پرنانی اماں بھی نہ پیدا ہوئی ہوں گی۔ ہاں، تو بات یُوں ہے کہ اس زمانے میں سب جانوروں میں بہت میل تھا۔ آج کل کی طرح نہیں کہ ایک دوسرے کی صورت دیکھی اور کاٹنے کو دَوڑے۔ تو جناب دوسرے جانوروں کی طرح ایک بِلّی اور ایک چوہا بھی ایک دوسرے کے بہت گہرے دوست تھے۔ اتنے گہرے کہ ایک ہی گھر میں رہا کرتے تھے۔ ارے بھئی ہنس کیوں پڑے؟ یقین نہیں آیا؟ ہم نے بتایا نا کہ اس زمانے میں سب جانور بہت میل ملاپ سے رہتے تھے۔ بلّی اور چوہے کا آپس میں بہت میل تھا۔ وہ ایک ساتھ کھانا کھاتے، ایک ساتھ گھومنے جاتے، غرض ہر کام اُن کا ساتھ ہوتا۔

تم جانو کہ بلّی کافی چالاک جانور ہے۔ ایک دن اُس نے چوہے سے کہا، "بھائی چوہے، سردیاں قریب ہیں، ہمیں تھوڑا سامان پس انداز بھی کرنا چاہیے، ورنہ جب اس میدان اور پاس کے جنگل میں چاروں طرف برف جمی ہوگی تو ہمیں خوراک تلاش کرنے میں بہت دِقّت ہوگی۔" چوہے کی سمجھ میں یہ بات آگئی۔ اب وہ دونوں پیٹ بھرنے کے علاوہ کچھ بچاکر بھی رکھنے لگے۔ ایک دن دونوں کو کسی بند گھر کے طاق پر مکھن کا ایک مرتبان رکھا ملا، پیلا پیلا، سوندھا سوندھا مکھن۔ دونوں کی بس رال ہی تو ٹپک پڑی۔ کسی نہ کسی طرح اُسے کھینچ کھانچ کر اُس بِل میں چھوڑ آئے، جسے انھوں نے اسٹور بنا رکھا تھا۔ یہ بِل کیا، ایک اچھی بڑی سے کھوہ تھی، جو ایک کھوکھلے درخت کے تنے میں تھا۔ مرتبان

اُس میں چھوڑ کر دونوں گھر آ گئے۔ چوہا تو اپنے کام میں لگ گیا، پر بلّی کا سارا دن کسی کام کاج میں دل نہ لگا۔ بار بار مکھن سے بھرے مرتبان کا خیال آجاتا اور وہ زبان چاٹ کر رہ جاتی۔ رات بھی اسی طرح مرتبان کے تصوّر میں گزر گئی۔ علی الصباح چوہے سے کہنے لگی، "بھیّا چوہے، میری سب سے بڑی بہن کی شادی ہو رہی ہے، میں اُس میں شرکت کرنے جا رہی ہوں، جلد ہی لَوٹ آؤں گی!" بھولا چوہا بولا "ضرور جاؤ، اپنی بہن کو میری طرف سے مبارک باد کہہ دینا۔" مکّار بلّی دل ہی دل میں مسکراتی کھوکھلے درخت تک پہنچ گئی۔ مرتبان کھولا، اوپر کا بہت سا مکھن کھا لیا۔ اور پھر چٹخارے بھرتی واپس چلی۔ سارے راستے مزے دار مکھن ہی کے بارے میں سوچتی رہی۔ گھر پہنچی تو چوہا اس کا منتظر تھا۔ اُسے دیکھتے ہی بولا، "بی بلّی بڑی جلدی لَوٹ آئیں۔" بلّی نے کہا، "آدھی تقریب میں سے آگئی۔ کیا کرتی تم جو اکیلے تھے۔" چوہے نے کہا، "بہن بلّی، تمھاری اس بہن کا نام کیا ہے، جس کی آج شادی تھی؟" بلی نے کہا، "تھوڑا ختم۔" "ہائیں!" چوہے کا منہ حیرت سے کھُلا کا کھُلا رہ گیا۔ "بھلا یہ کیا نام ہوا!" اس نے بلی سے دریافت کیا۔ بلی نے کہا، "ہمارے گھرانے میں ایسے ہی نام رکھے جاتے ہیں۔" بات آئی گئی ہو گئی، مگر تم جانو اب بلّی کا دل بھلا دوسری چیزوں میں کیسے لگتا، جب کہ ہر وقت اسے لذیذ مکھن کا خیال ستائے رہتا۔ آخر پھر جب صبر کر نہ سکی تو چوہے سے کہنے لگی، "آج میری دوسری بہن کا بیاہ ہے، تم کہو تو ہو آؤں؟" چوہے نے جواب دیا، "اس میں میرے کہنے کی کیا ضرورت ہے، جاؤ، بلکہ فوراً جاؤ اور دیکھو میری طرف سے مبارک باد کہہ دینا اپنی بہن سے۔" بلی دل ہی دل میں اپنی مکاری پر ہنستی روانہ ہوئی۔ مرتبان میں سے مکھن کھایا۔ اس دفعہ وہ آدھا ختم کر گئی اور پھر منہ پونچھ واپس آگئی۔ چوہے نے کہا، "کہو بہن تقریب کیسی رہی؟" "بہت عمدہ!" بلی نے جواب دیا صرف تمھاری کمی تھی۔ چوہے نے پوچھا، "تمھاری اس والی بہن کا کیا نام ہے؟" بلی نے کہا، "آدھا ختم۔" "اس سے بھی حیرت انگیز!" چوہے کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ کئی دن اسی طرح گزر گئے اور بلی مکھن کا مزے دار ذائقہ نہ بھلا سکی۔ آخر کچھ سوچ کر چوہے کے پاس پہنچی اور کہنے لگی، "چوہے میاں میرا دل تو نہیں کرتا، لیکن جانا ہی پڑے گا۔ آج میری تیری بہن کی شادی ہے۔" چوہے نے اسے خوشی سے رخصت کیا۔ بلی وہاں سے رخصت ہو کر سیدھی درخت کے تنے میں چھپے مرتبان کے قریب پہنچی اور کوئی تین چوتھائی کے قریب ہڑپ

کر گئی ۔ گھر پہنچنے پر حسبِ معمول چوہے نے تقریب کا حال پوچھا اور نام دریافت کیا۔ بلی نے منہ پھلا کر کہا، "قریب الختم"

"کیا؟ بھئی یہ نام اپنی سمجھ میں تو آتے نہیں۔" چوہے نے تعجب سے اپنا سر کھجاتے ہوئے کہا۔ پھر دونوں اپنے اپنے دھندوں میں لگ گئے ۔ کئی دن ہو گئے، اس مرتبہ بلّی بہت صبر سے بیٹھی تھی، مگر پھر جب ایک دن مکھن میں سے نکلتی ہوئی سوندھی سوندھی خوشبو کا خیال آیا تو وہ بے تاب ہو کر چوہے کے پاس پہنچی اور بولی، "آج میں اپنی سب سے چھوٹی بہن کی شادی میں جا رہی ہوں۔" چوہے کے پاس سے رخصت ہو کر اپنے ٹھکانے پر گئی اور اس مرتبہ سارا مرتبان ہی صاف کر دیا۔ گھر میں جب چوہے نے پچھلی تین دفعہ کی طرح اس مرتبہ بھی اُس کی بہن کا نام پوچھا تو بولی، "پورا ختم" چوہے کو حیرت تو بہت ہوئی مگر چھپا گیا۔

سردیاں آ چلی تھیں، چاروں طرف برف پھیلی رہتی اور اکثر دونوں کے لیے گھر سے نکلنا دشوار ہو جاتا۔ آخر ایک دن چوہے نے بلی سے کہا، "چلو آج وہ سامان بل میں لے آئیں، جو ہم نے بچایا ہے۔" دونوں کھوہ میں پہنچے ۔ اناج کے دانے تو صحیح و سالم موجود تھے، مگر مرتبان خالی! چوہے نے سر پیٹ لیا، "بی بلّی، یہ کیا؟" بلی مسکراہٹ چھپا کر بولی، "میں کیا جانوں؟ یہ کس کی کارستانی ہے،" لیکن چوہے کی سمجھ میں سارا معاملہ آ چکا تھا۔ اُس نے کہا،

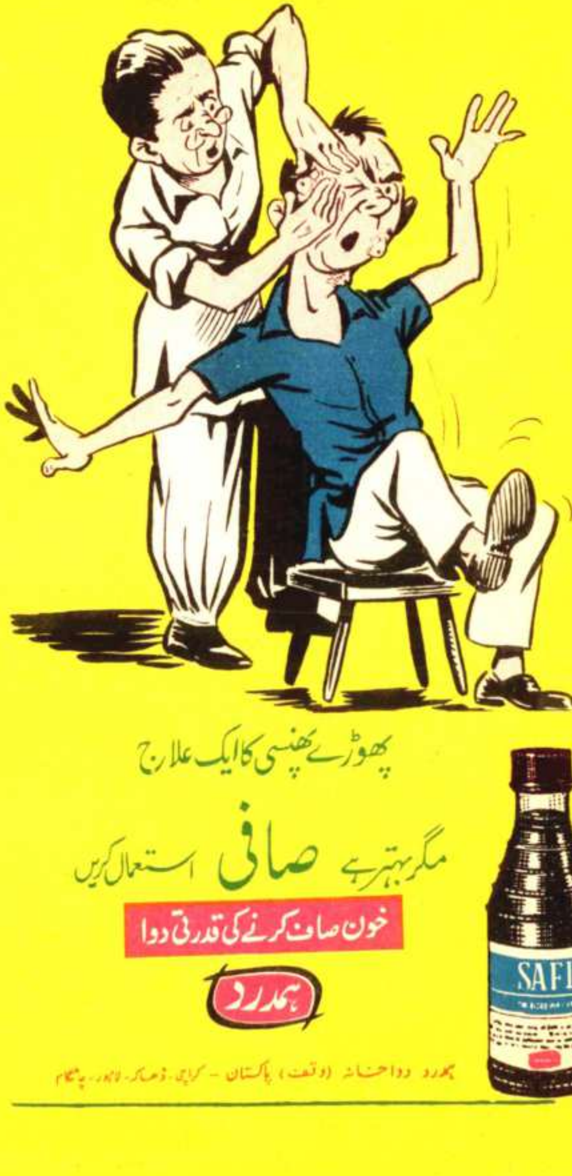
"تمھاری چار لالچی بہنوں کی کارستانی ہے۔"

"کیا بکتے ہو؟" بلّی غرائی۔ "ٹھیک ہی تو کہتا ہوں!" چوہے نے کہا۔ بلّی اُس کے پیچھے لپکی، مگر چوہا لپک کر ایک سوراخ میں گھُس گیا، جو وہ پہلے ہی تاک چکا تھا، تو بس سمجھو وہ دن اور آج کا دن ۔ بلّی اور چوہے میں زبردست دشمنی چلی آتی ہے ۔ جہاں بلی نے چوہے کو دیکھا اور وہ لپکی ۔

ہنستے رہیے۔ آپ کی ہنسی بڑی خوب صورت ہے
مولیر

جناب ، ہنسیے اور موٹے ہو جائیے
بن جانسن

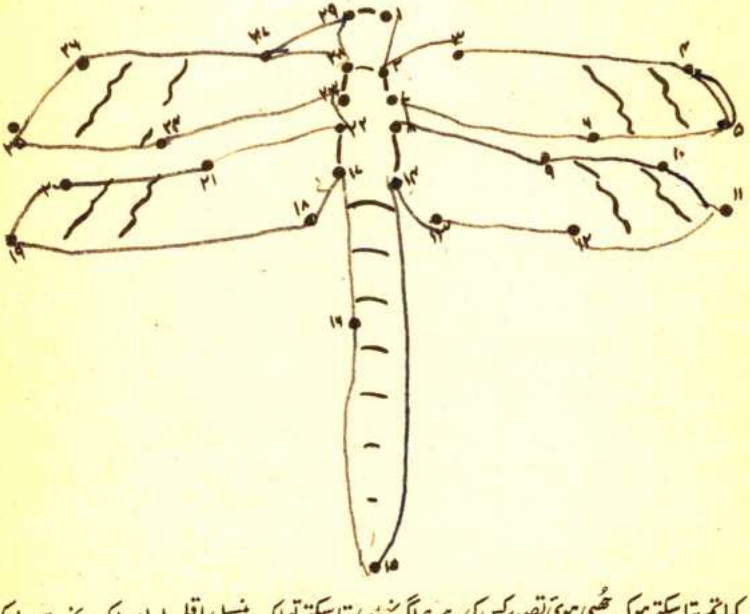

دانتوں کی تکلیف کا
ایک عِلاج
مگر بہتر ہے
ہمدرد منجن
اِستعمال کریں
ہمدرد



پھوڑے پھنسی کا ایک علاج
مگر بہتر ہے صافی استعمال کریں
خون صاف کرنے کی قدرتی دوا
ہمدرد
SAFI
ہمدرد دواخانہ (وقف) پاکستان - کراچی۔ ڈھاکہ۔ لاہور۔ چٹاگام



یہ تصویر کِس کی ہے؟



کیا تم بتا سکتے ہو کہ یہ چھُپی ہوئی تصویر کس کی ہے؟ اگر نہیں بتا سکتے تو ایک پنسل یا قلم لو اور ایک نمبر سے لے کر ۲۹ نمبر تک کے سب نقطوں کو سلسلہ وار آپس میں ملا دو، تمھیں چھُپی ہوئی تصویر صاف نظر آجائے گی۔

خالد خلیل نعمانی

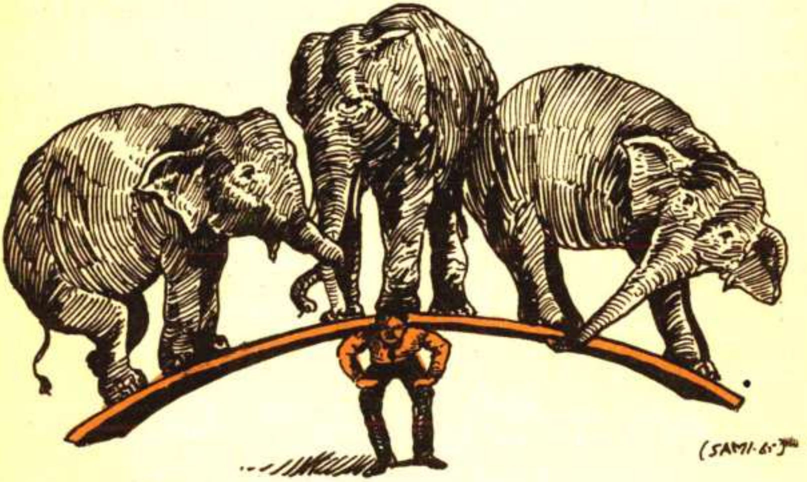
پیگوڈا مندر

جو
ہوا کے ساتھ ساتھ ہلتا ہے



جب پوجا کرنے والے اس پیگوڈے میں پوجا کے لیے داخل ہوتے ہیں تو دوسری دنیا کا تصوّر ان کے دماغ پر چھایا رہتا ہے۔ یہ مندر جو کیاکیٹا پیگوڈا کے نام سے مشہور ہے، برما کے علاقہ میں واقع ہے۔ پیگوڈا ایک ڈھلوان پہاڑی پر ایک بہت بڑی گول چٹان پر بنا ہوا ہے۔ اس پہاڑی کے دوسری طرف ایک گہری کھائی ہے۔ جب بھی ہوا چلتی ہے، یہ گول چٹان جس پر پیگوڈا بنا ہے، آہستہ آہستہ ہلتی ہے۔

نظر نہ آنے والا سمندر، جس میں ہم ڈوبے رہتے ہیں



تین ہاتھیوں کا وزن ہم ہر وقت اُٹھائے پھرتے ہیں

تین ہاتھیوں کو اس طرح سر پر لے کر چلنا بڑے سے بڑے پہلوان کے بھی بس کی بات نہیں ہے، مگر ہم میں سے ہر ایک ہر وقت تین ہاتھیوں سے زیادہ وزن اُٹھائے پھرتا ہے، مگر اُسے محسوس نہیں ہوتا۔ حیرانی کی بات نہیں!

ایک درمیانی آدمی کے جسم پر تیس ہزار پونڈ کے برابر ہوا کے وزن کا دباؤ ہوتا ہے اور یہ دباؤ تین بڑے ہاتھیوں کے وزن سے بھی زیادہ ہے۔ زمین کے چاروں طرف ہوا کا ایک حلقہ ہوتا ہے جس کا دباؤ ۱۴٫۷ پونڈ فی مربع انچ ہے۔ اسی حساب سے انسان کے جسم پر ہر وقت ہوا کا کافی دباؤ رہتا ہے اور ہم ہر وقت ہوا کے سمندر میں ڈوبے رہتے ہیں۔

پرندوں کے پنجے اُن کی کہانی کہہ دیتے ہیں

ہاتھ کی لکیریں دیکھنے والے جس طرح انسان کا ہاتھ دیکھ کر اس کی قسمت کا حال بتاتے ہیں، اسی طرح پرندوں کے پنجے دیکھنا بھی ایک باقاعدہ علم بن گیا ہے اور اس کے ماہر پرندے بھی بہت کچھ بتا دیتے ہیں۔ مثلاً ایک پنجے دیکھنے والا پرندہ شتر مرغ (۱) کا پنجہ دیکھ کر کہے گا، "آپ کے بزرگ جو لاکھوں سال پہلے اس دنیا میں تھے، ان کے پانچ انگلیاں ہوتی تھیں، تین انگلیاں غائب ہو گئی ہیں۔ چوں کہ آپ کے خاندان والے بہت دوڑا کرتے تھے، اس لیے تیسری انگلی بہت بڑی ہو گئی ہے اور چھوٹی انگلی اکیلی رہ گئی ہے، وہ بھی شاید غائب ہو جائے۔ آپ کے پوتے پڑپوتے شاید بغیر انگلیوں کے ہی پیدا ہوا کریں گے۔ یہ سب کچھ بالکل اسی طرح ہوگا، جس طرح گھوڑے کے ساتھ ہوا۔

دوسری بات جو پنجے دیکھنے والا پرندہ ان جانوروں کے پنجے دیکھ کر کہے گا، "معاف کیجیے۔ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، اس کا برا نہ مانیے۔ آپ کے بزرگ رینگنے والے جانور (ریپٹائلس REPTILES) تھے۔" یہ سب کچھ وہ ماہر پرندہ پیروں پر چھلکے نما نشان دیکھ کر کہے گا۔

صرف ٹانی الو (TAWNY OWL) (شکل ۸) اور ٹارمیگن (PTARMIGAN) (شکل ۹) کے پیروں کے حصے پروں سے ڈھکے رہتے ہیں۔ جن پرندوں کے پیروں پر چھلکے ہوتے ہیں، وہ یہ ہیں۔

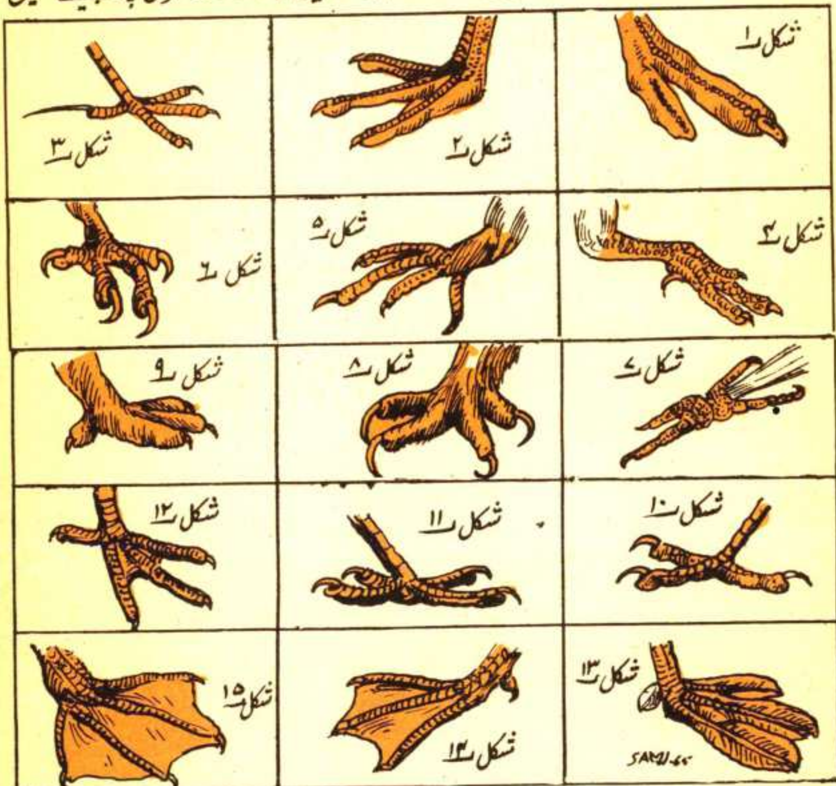
۱۔ اسکائی لارک SKYLARK (شکل ۳)
۲۔ ایپٹرکس APTERYX (شکل ۴)
۳۔ نائٹ جار NIGHT JAR (شکل ۵)
۴۔ سمندری عقاب SEA EAGLE (شکل ۶)
۵۔ ٹیوکن TOUCAN (شکل ۷)
۶۔ کھٹ بڑھئی WOOD PECKER (شکل ۱۰)
۷۔ سبز کھٹ بڑھئی GREEN WOOD PECKER (شکل ۱۱)
۸۔ بگلا STORK (شکل ۱۲)
۹۔ گریب GREBE (شکل ۱۳)
۱۰۔ مرگین سر MERGANCER (شکل ۱۴)
۱۱۔ حواصل یا ماہی خور PELICAN (شکل ۱۵)

بگلا اور حواصل اکثر پانی میں جاتے ہیں۔ بگلے کے پیر کے صرف پہلے جوڑ تک انگلیاں جڑی رہتی ہیں۔

گریب کے پیر کی ہر انگلی دوسری سے

چوڑی کھال سے جڑی ہوئی نہیں ہوتی، بلکہ ہر انگلی کے ساتھ چوڑی کھال ہے، تاکہ وہ آسانی سے زمین پر چل سکے اور تیر بھی سکے۔

تاکہ چلتے وقت وہ اپنا توازن قائم رکھ سکے۔ کھٹ بڑھئی (شکل ۱۰ و ۱۱) کے پیر ایسے ہوتے ہیں کہ اسے درختوں پر بیٹھنے میں



پلوور (PLOVER) (شکل ۲) ویسے تو پانی کا پرندہ ہے، مگر وہ اکثر پانی کے کنارے کیچڑ اور ریت میں بھی چلتا ہے، اس لیے اس کی انگلیاں جھلی سے جڑی ہوئی نہیں ہوتیں، بلکہ کافی بڑی ہوتی ہیں،

مدد ملے۔ ٹیوکن کے پیر میں دو انگلیاں باہر کی طرف اور ایک پیچھے ہوتی ہے۔

الّو (شکل ۸) کی تیسری انگلی ایسی ہوتی ہے، جس کو وہ ضرورت کے وقت آگے اور پیچھے استعمال کر سکتا ہے۔

آپ کی ہتھیلی پر ہرن کھڑا ہو سکتا ہے ؟



بظاہر یہ ایک عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے، مگر ایسا ہو سکتا ہے۔ ملائشیا کے ملک میں ایک ایسا ہرن پایا جاتا ہے، جو پانی کے گلاس کے برابر اونچا ہوتا ہے اور آپ اس کو اپنے ہاتھ کی ہتھیلی پر کھڑا کر سکتے ہیں۔ ملائشیا کے باشندے اس ہرن کو چوہا ہرن (MOUSE DEER) کہتے ہیں۔ جنگل میں جو بڑے بڑے ہرن چوکڑی بھرتے پھرتے ہیں یا کسی چڑیا گھر میں نظر آتے ہیں۔ یہ ننھا منّا ہرن ان کا پورا پورا چربہ ہے۔

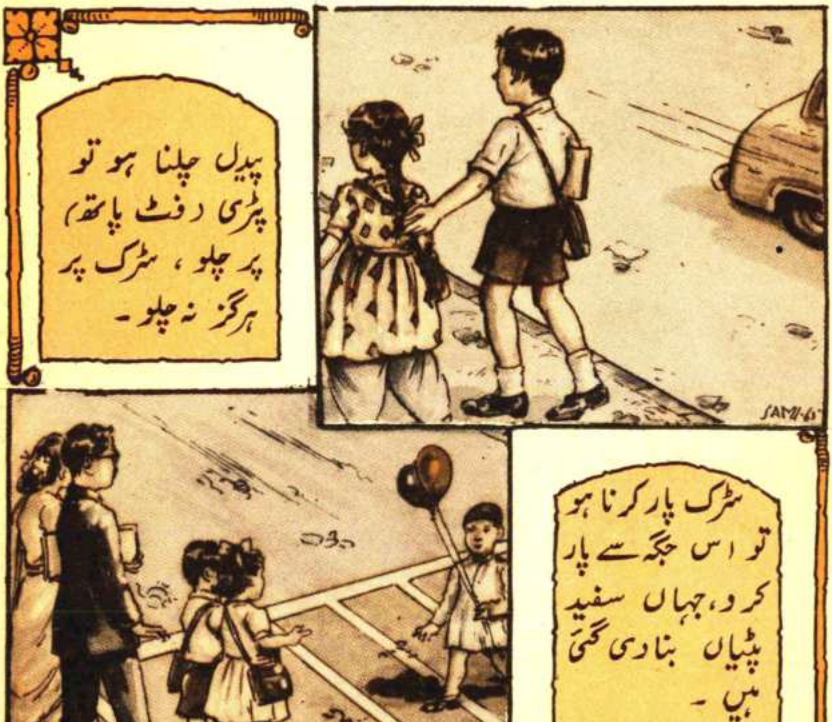
نر ہرن کی طرح اس کے سینگ نہیں ہوتے۔ یہ منڈا ہوتا ہے۔ دیکھنے میں نہایت نازک اور حسین۔ اس ہرن کا نازک اور خوب صورت سر چوہے سے بھی چھوٹا ہوتا ہے۔ اگر ایک چوہے کو اس ہرن کے سامنے کھڑا کر دیا جائے تو چوہے کا سر ہرن کے سر سے کافی بڑا نظر آئے گا۔ بڑے ہرن دوڑنے میں مشہور ہوتے ہیں اور بہت تیز دوڑتے ہیں۔ اسی طرح یہ ننھا منّا ہرن بھی دوڑتا ہے اور دوڑنے میں اس کا جواب نہیں۔ یہ بالکل چھوٹے جیٹ طیارے کی طرح تیز دوڑتا ہے۔ یہ کچھ قدم چلتا ہے اور پھر چھلانگ لگاتا ہے۔ اور بالکل ربڑ کی گیند کی طرح دوڑتا ہے۔ ملائشیا کے باشندے اس ہرن کو غیبی طاقت کا مالک سمجھتے ہیں اور بجائے ہرن کے اس کو پری کہتے ہیں۔ کئی سیاحوں نے اس ہرن کو پکڑ کر لے جانے کی کوشش کی، مگر وہ زیادہ دن تک زندہ نہیں رہا۔

شہری شعور

سڑک پر کیسے چلیں؟

آئے دن اخبارات میں ٹریفک کے حادثات کی خبریں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ان حادثات میں ذرا سی غفلت کی بنا پر قیمتی جانیں ضائع ہوجاتی ہیں۔ اس قسم کے حادثات سے ہمارے شہری شعور (CIVIC SENSE) کی کمی ظاہر ہوتی ہے۔ یہ فیچر غور سے پڑھو اور اپنے ساتھیوں کو بھی پڑھواؤ۔

آئندہ بھی ہم کبھی کبھی ایسے فیچر شائع کرتے رہیں گے۔





جس سڑک پر پٹیاں نہ ہوں وہاں اس جگہ سے سڑک پار کرو، جہاں اور لوگ بھی جا رہے ہیں۔

جو سڑک دو طرفہ (ٹو۔ وے) ہو، اس کو پار کرتے وقت پہلے سیدھی طرف دیکھو اور بیچ سڑک پر پہنچ کر بائیں طرف دیکھو، پھر سڑک پار کرو۔





کبھی کسی بس، موٹر یا کسی
گاڑی کے پیچھے نہ دوڑو
اور نہ اس کے پیچھے لٹکو
اس میں حادثے کا
بڑا خطرہ ہے۔

جہاں فٹ پاتھ نہ
ہو وہاں سڑک
کے بالکل کنارے،
جس طرف عمارتیں ہوں
اس طرف چلو۔





بس یا ٹرام جب
اسٹاپ پر کھڑی
ہو جائے تب
اس پر سوار ہو
یا اترو۔

سڑکوں اور فٹ پاتھ پر
گیند بلا، گلی ڈنڈا
یا کوئی اور کھیل
کھیلنا یا پتنگ اڑانا
بے حد خطرناک ہے۔



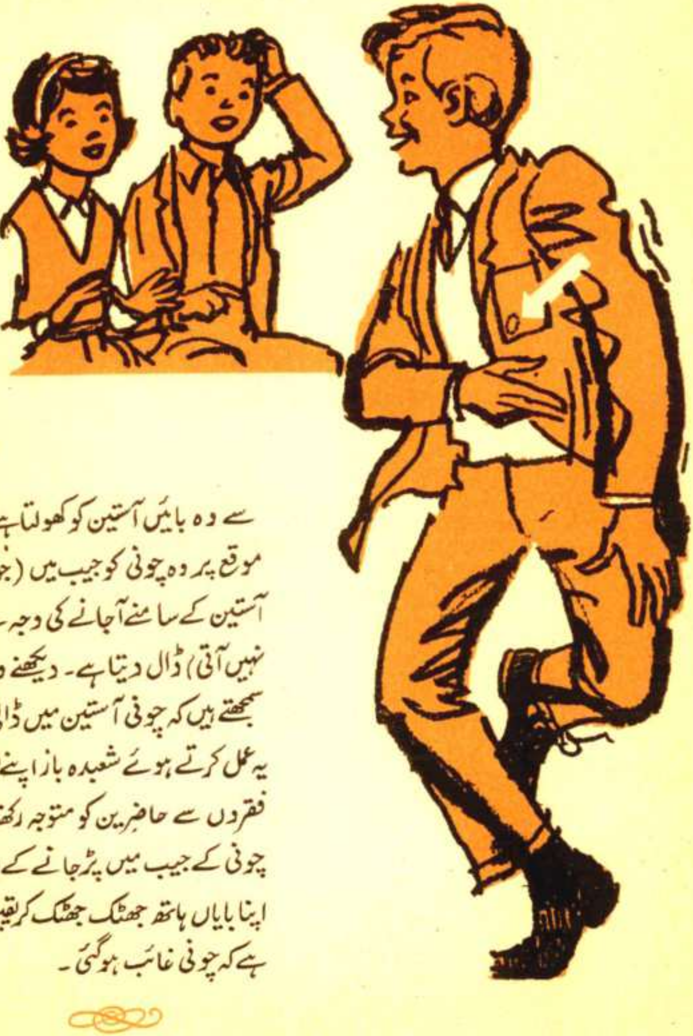


آستین میں چونّی

اس شعبدہ میں شعبدہ باز، حاضرین سے کہتا ہے کہ میں آپ سب حضرات کے سامنے یہ چونّی اپنی آستین میں ڈالتا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ دائیں ہاتھ میں ایک چونّی دکھاتا ہے اور سب کے سامنے اپنا بایاں ہاتھ اُٹھا کر وہ چونی بائیں ہاتھ کی آستین میں ڈال دیتا ہے۔ اس کے بعد بایاں ہاتھ نیچے کرلیتا ہے، مگر چونّی اس میں سے نہیں نکلتی۔ وہ زور زور سے ہاتھ جھٹکتا ہے مگر چونّی بالکل غائب ہو جاتی ہے۔

اس کا راز: یہ شعبدہ اس طرح کیا جاتا ہے کہ چونّی بائیں ہاتھ کی آستین میں ڈالی ہی نہیں جاتی، بلکہ بایاں ہاتھ سینے تک اس طرح بلند کیا جاتا ہے کہ اس کی آستین سے بائیں جانب والی اوپر کی جیب چھپ جاتی ہے۔ دائیں ہاتھ کے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی میں چونّی نظر آتی ہے۔ دوسری انگلیوں





سے وہ بائیں آستین کو کھولتا ہے۔اس موقع پر وہ چونی کو جیب میں (جو بائیں آستین کے سامنے آجانے کی وجہ سے نظر نہیں آتی) ڈال دیتا ہے۔ دیکھنے والے یہی سمجھتے ہیں کہ چونی آستین میں ڈالی گئی۔ یہ عمل کرتے ہوئے شعبدہ باز اپنے دل چسپ فقروں سے حاضرین کو متوجہ رکھتا ہے۔ چونی کے جیب میں پڑ جانے کے بعد وہ اپنا بایاں ہاتھ جھٹک جھٹک کر یقین دلاتا ہے کہ چونی غائب ہو گئی۔



چمگادڑ

چمگادڑ نہ تو خوب صورت ہوتی ہے، نہ دیکھنے میں ذہین نظر آتی ہے۔ اگر تم اس کو سر نیچے لٹکائے اور پیر اوپر درخت کی شاخ میں لٹکے ہوئے دیکھو گے اور اس کی موتی جیسی چھوٹی آنکھیں جو دن کی روشنی میں بار بار بند ہوتی اور کھلتی ہیں تم کو نظر آئیں گی تو تم پر ذرا بھی کسی قسم کا اثر نہیں ہوگا، لیکن مسلسل اس کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے بعد تم اس کی ضرور قدر کرو گے۔
کیا تم نے وہ گہرے کالے رنگ کے جھلّی نما بازو جیسے پر نہیں دیکھے، جس سے وہ اپنے جسم کو ڈھانکے رہتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی کپڑا پہن رکھا ہے۔ دنیا کا سب سے نازک حس رکھنے والا عضو یہی جھلّی ہوتی ہے۔ چمگادڑ کو اپنے ہاتھ میں پکڑو، وہ تمھیں کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچائے گی۔ اس کے کھلے ہوئے چونچ دار منھ سے نہ ڈرو۔ تم محسوس کرو گے کہ چمگادڑ کا تمام جسم بُری طرح کانپ رہا ہے۔ اس کی وجہ تمھاری ہتھیلی ہے۔ اس کو ایسا معلوم ہوتا ہے کوئی ریتی سے اس کو رگڑ رہا ہے اور یہی اس کے کانپنے کی وجہ ہے۔
جھلّی والے بازو اور بڑے بڑے کان چمگادڑ کے عجیب و غریب اعضا ہیں جن سے وہ کسی چیز کو بغیر دیکھے محسوس کرتی ہے۔ ان کی مدد سے رات کے وقت چمگادڑ کافی اندھیرے میں کیڑوں کا شکار کرتی ہے اور گھنے جنگل میں سے گزرتے وقت کسی درخت سے بھی نہیں ٹکراتی۔ اس کی چھوٹی آنکھیں اس کی کوئی مدد نہیں کرتیں۔
چمگادڑ کے ربڑ جیسے پروں میں اعصاب کا ایک جال ہوتا ہے، جو اس کو کسی آنے والے

خطرے سے آگاہ کر دیتا ہے اور ہوا کے کسی سخت چیز سے ٹکرانے کا احساس بھی کر لیتی ہے۔ عام طور پر چمگادڑ دن کے وقت غاروں، درخت کے کھولوں، ویران مکانوں، گنبدوں، گرجا گھر کی چھت اور ایسی گلیوں پر رہتی ہے، جہاں اندھیرا ہوتا ہے۔ یہ زمین پر نہیں اُترتی کیوں کہ پھر اُڑ نہیں سکتی ہے۔ یہ مشکل سے زمین پر رینگتی ہے۔ اُڑنے کے لیے اسے کسی اونچی جگہ پر جا کر ہوا میں چھلانگ

کی چمگادڑیں کیڑے مکوڑے کھا کر اپنا پیٹ بھرتی ہیں اور وہ انسان کے لیے کار آمد ہوتی ہیں۔ دراصل چمگادڑیں ہماری رات کی پہرے دار ہیں، جو فصلوں اور باغوں کی حفاظت کرتی ہیں اور کیڑے کھا جاتی ہیں۔ امریکا کے بعض علاقوں میں اُن کے رہنے کے لیے جگہیں بنا دی گئی ہیں اور وہاں سے مچھر غائب ہو گئے ہیں۔ ان کے متعلق یہ غلط خیال ہے کہ یہ عورتوں کے بالوں میں اُلجھ کر خوش ہوتی ہیں۔ یہ



لگانا پڑتی ہے۔ تقریباً ۳۰۰ قسم کی چمگادڑیں دُنیا کے مختلف علاقوں میں پھیلی ہوئی ہیں اور یہ سب چھوٹی قسم کی ہیں۔ ملائشیا کی اُڑنے والی بڑ باگل (FLYING FOX) کے پَر ایک سرے سے دوسرے سرے تک ۵ فیٹ ہوتے ہیں۔ یہ اور دوسری اسی علاقے کی بڑ باگلیں صرف پھل کھاتی ہیں، اس لیے ان سے فصلوں کو کافی نقصان پہنچتا ہے۔ شمالی علاقوں

صرف ایک وہم ہے۔ بعض گرم ملکوں کی خون چوسنے والی چمگادڑیں گھوڑوں، گایوں اور بیلوں کی پیٹھ اور سوتے ہوئے آدمی کے جسم سے خون چوس لیتی ہیں اور اتنا کمزور کر دیتی ہیں کہ وہ مر جاتا ہے۔ اس قسم کی چمگادڑیں ہمارے ملک میں نہیں پائی جاتیں۔ یہاں کی چمگادڑیں انسان کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتیں۔

صحت مند نونہال

اس صفحہ پر ہر ماہ صحت مند نونہالوں
کی تصویریں شائع کی جائیں گی۔
جلدی سے اپنی تصویر بھیج دو !



غزالہ حسن، کراچی



شہناز، جاوید، سہیل، کراچی



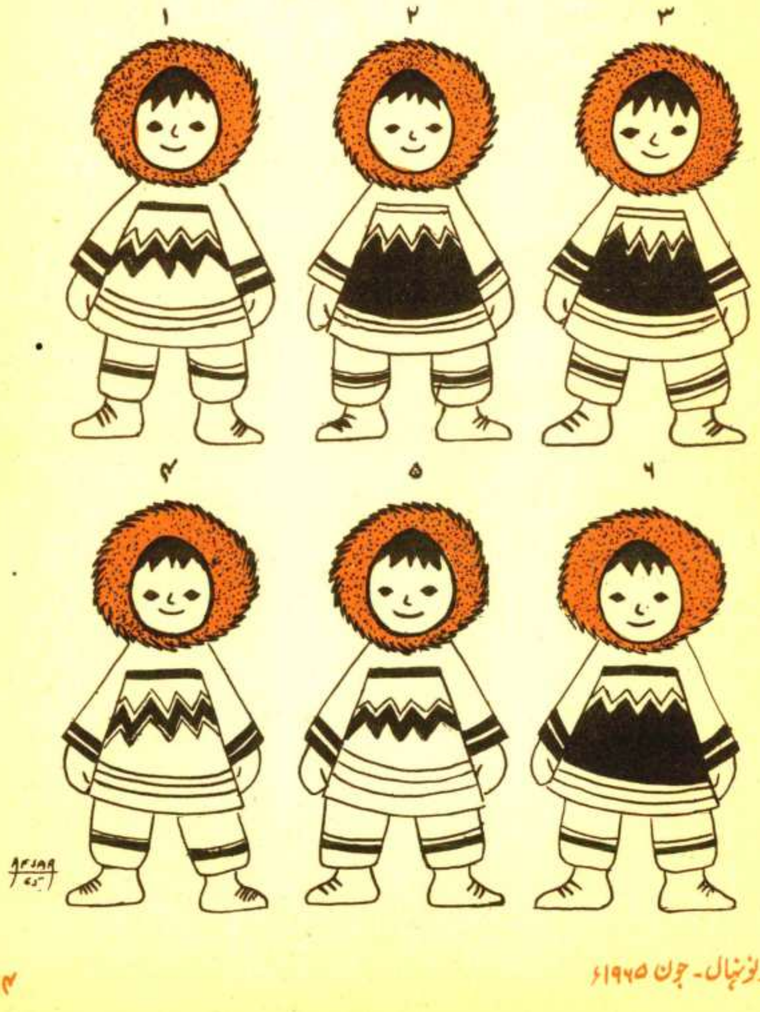
عاصیہ نصراللہ، کراچی



عبداللہ غیاث، اجمیر

دو بھائی

نیچے ۶ انڈین بھائیوں کی تصویریں ہیں، جن میں ۲ بھائیوں نے ایک سے کپڑے پہن رکھے ہیں۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ وہ ۲ دو بھائی کون کون سے ہیں۔ ؟



اپنی صحت اپنے ہاتھ!

ہمارے دانت

عشرت رحمانی



تم نے اپنے اسکول یا محلے میں کسی لڑکے کو اس طرح منہ بسورتے دانت کے درد سے چیختے چلّاتے دیکھا ہوگا۔ تمھیں اس پر ترس بھی آتا ہوگا اور اس کے ساتھ اس کے دُکھ درد میں ہمدردی کرتے ہوگے! مگر سچ پوچھو تو ایسا لڑکا ہمدردی کے قابل نہیں سمجھا جا سکتا۔ تم کہو گے یہ بات تو بڑی بے رحمی کی ہے، مگر تم خود سوچو کہ جس نے اپنے ایسے خادموں کے ساتھ ہمدردی نہیں کی، جو اس کی خدمت کے لیے ہر وقت تیار کھڑے رہتے ہیں اور ان کی طرف سے لاپروائی برت کر ان کا یہ حال کر دیا کہ وہ دکھ میں مبتلا ہو گئے اور ان کے ساتھ اب اس لڑکے کو تکلیف ہو رہی ہو تو قصور کس کا ہے؟

اگر ان دانتوں کو زبان مل جائے اور بولنے کی قدرت آجائے تو وہ درد میں مبتلا چیختے چلّاتے لڑکے سے ضرور پوچھیں:

"میاں اب کیوں رو رہے ہو؟ ہماری خبر گیری نہیں کی۔ ہم میں کسی ایک یا دو تین نے تمھیں

اب سے پہلے تمھاری لاپروائی کے سبب تھوڑی سی خرابی پیدا ہوجانے کی خبر تمھیں ہلکی سی ٹیس دکھا کر کردی تھی اور تم نے کچھ خیال نہیں کیا۔ بس اپنی لاپروائی سے ہماری دیکھ بھال سے غافل رہے اب یہ نوبت پہنچی کہ ہماری حالت اتنی بگڑ گئی۔ ہمارے ساتھ اب اس دکھ درد کا مزا چکھو۔ اصل تکلیف میں تو ہم مبتلا ہیں۔ ہم بے زبان ہیں۔ خود اپنی صفائی اور احتیاط نہیں کرسکتے۔" اب بھئی ذرا انصاف سے سوچو اور بتاؤ کہ اگر تمھارے کسی ساتھی کے درد کے موقع پر اس کے دانت اس سے اس طرح کی بغاوت کریں تو تم اس بغاوت کو بیجا سمجھوگے یا بجا کہوگے ؟ بات یہ ہے کہ جب کوئی لڑکا یا لڑکی اپنے دانتوں کی حفاظت نہ کرے اور ان سے بغاوت کرتے رہیں، پھر دانتوں کا بغاوت کرنا بالکل درست ہے۔

اگر تم سے کوئی پوچھے کہ "تمھارے منھ میں کتنے دانت ہیں ؟ تو شاید تم یہ سن کر سمجھوگے کہ اعتراض یا دل لگی سے کہہ رہے ہیں، مگر یہ بالکل سیدھا سادہ سا سوال ہے۔ اس کا جواب تم آئینے میں اپنا منھ کھول کر دانتوں کو گن کر دوگے اور اتنی دیر آئینے کے سامنے منھ کھلا رہنے سے تمھارا منھ بھی دکھنے لگے گا۔ ہم تمھیں آسان طریقہ اس سوال کے جواب کا بتائے دیتے ہیں۔

جس لڑکے یا لڑکی کی عمر چودہ سال کی ہو اس کے منھ میں کُل ۲۸ دانت ہوتے ہیں۔ چودہ اوپر کی طرف اور چودہ نیچے۔ کم عمر بچوں کے دانت بڑے بچوں سے بھی کم ہوتے ہیں۔ تمھارے گھر میں کوئی چھوٹا بچّہ ہو تو اس کے دانت گن کر دیکھو۔ چھے سال کے لگ بھگ عمر کے بچوں کے کُل بیس دانت ہوتے ہیں۔ یہ سارے دودھ کے یعنی کچے دانت کہلاتے ہیں۔ جب بچہ بڑا ہوتا جاتا ہے تو یہ دانت ایک ایک کرکے گرتے اور ان کی جگہ پکے دانت نکلتے جاتے ہیں، یہاں تک کہ چودہ سال کی عمر تک اٹھائیس دانت پختہ ہو جاتے ہیں۔ ان میں دانت اور ڈاڑھیں سب شامل ہیں، لیکن چودہ سال سے لے کر ۲۵ سال کی عمر تک ایک ایک کرکے چار ڈاڑھیں اور نکلتی ہیں اور انھیں عقل ڈاڑھیں کہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کے نکلنے کے بعد آدمی عقل مند ہوتا ہے۔ نہیں تو بے وقوف رہتا ہے۔ دانت یا ڈاڑھ سے عقل کا کوئی واسطہ نہیں۔ ان کا تو کام ہی الگ ہے۔ دراصل جب انسان اپنی پوری جوانی کی عمر کو پہنچتا ہے تو اس کے پورے بتیس ۳۲ دانت نکل آتے ہیں۔ ان چاروں ڈاڑھوں کے نکلنے کے زمانے میں بڑی تکلیف ہوتی ہے۔

تم میں نے آئینے میں یہ تو دیکھا ہوگا کہ تمھارے منھ میں جتنے دانت ہیں، ان کی شکلیں بھی الگ

الگ ہیں اور ان کے کام بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں، مثلاً جبڑے کے عین درمیان میں جو لمبا دانت ہے وہ کسی چیز کو کاٹنے یا کترنے کے کام آتا ہے۔ جبڑے کے موڑ پر جو دانت ہے، اس کا کام کھانے کی چیزوں کو چیر پھاڑ کرنا ہے۔ اس کے بعد دوسرے دانت چبانے کا کام کرتے ہیں اور کھانا ہضم کرنے کے لیے اچھی طرح چابنے میں مدد دیتے ہیں۔

ان میں سے ہر ایک دانت کو غور سے دیکھو تو معلوم ہو گا کہ ایک ایک بڑی مضبوطی کے ساتھ جبڑے میں جڑا ہوا ہے اور ہر دانت کی جڑ بہت گہری اندر تک پیوست ہے۔ اوپر کے سرے پر ایک خول سا چڑھا ہوا ہے، جیسے دیوار میں ایک ایک اینٹ ٹھونک کر لگاتے ہیں اور پھر ان اینٹوں کو مضبوطی سے جڑنے کے لیے مسالا لگا دیتے ہیں کہ آسانی سے اکھڑنے نہ پائیں۔ دانتوں کو قدرت نے اس سے بھی زیادہ مضبوطی سے ہمارے جبڑوں میں چڑھا کر قدرتی مسالے سے چپکا دیا ہے اور ان کے اوپر ایک روغنی قسم کا ملمع بھی کر دیا ہے، تاکہ بدنما نہ معلوم ہوں اور مضبوط سے مضبوط چیز ہم ان دانتوں سے کاٹیں تو ہلنے بھی نہ پائیں۔ یہ سفید رنگ کا مسالا ہمارے دانتوں کی حفاظت بھی کرتا ہے اور چمک کو بھی قائم رکھتا ہے، تاکہ خوشنما نظر آئیں۔

ہمارا فرض یہ ہے کہ قدرت کے اس انمول مسالے کی حفاظت کریں۔ اُسے خراب اور ضائع نہ ہونے دیں، جو ہمارے دانتوں کی حفاظت کرتا ہے۔ جب ہم اس مسالے کی حفاظت سے غافل ہو جائیں، دانتوں کی صفائی باقاعدہ نہ کریں، ان پر کھانے کی چیزوں کے ریزے یا میل جمنے دیں اور مسالے کے ضائع ہونے کی پروا نہ کریں تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دانتوں کی جڑیں اور اندرونی حصّے بھی خراب ہونا شروع ہو جاتے ہیں اور یہ خرابیاں ہمارے دانتوں کے اندر کی رگوں، مسوڑھوں اور خون کی شریانوں کو گندہ کر کے ہمیں دُکھ درد میں مبتلا کرنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ یہ درد بڑھتے بڑھتے دانتوں میں قسم قسم کی گندی بیماریاں پیدا کرتا ہے۔ مسوڑھے سڑ جاتے ہیں، ان میں زخم ہو جاتے ہیں۔ ان گندے زخموں کی پیپ اور خون کھانے کے ساتھ پیٹ میں جاتی اور معدے کو خراب کر کے طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا کرتی ہے۔

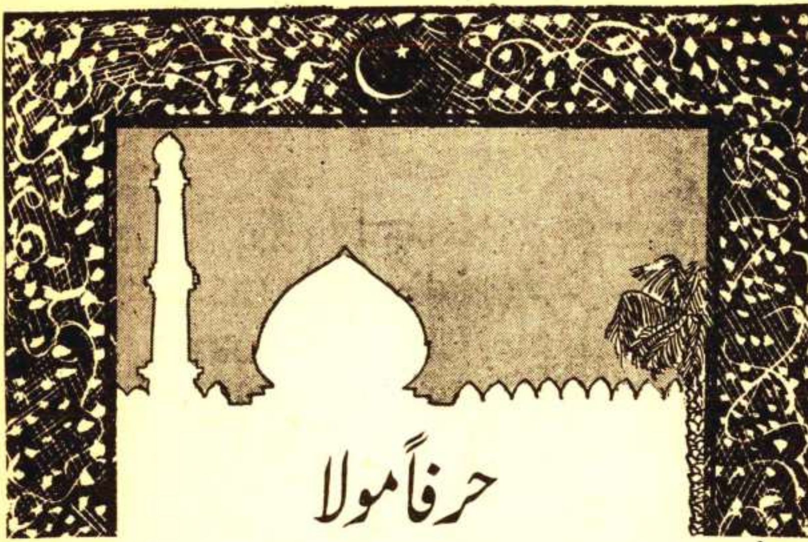
معمولی احتیاط اور دانتوں کی دیکھ بھال نہ کرنے سے ہم ان بیماریوں کو خود بُلاتے اور اپنے جسم اور جان کو روگ لگا بیٹھتے ہیں۔ اگر شروع سے خیال رکھیں تو ان دُکھوں اور تکلیفوں کی نوبت ہی نہ آئے۔

بات صرف اتنی ہی ہے کہ جب ہم کوئی چیز کھاتے ہیں تو اس کے ننھے ننھے ریزے یا

ریشے دانتوں کی جڑوں میں کسی نہ کسی جگہ پھنسے رہ جاتے ہیں۔ خاص طور پر کھانا کھانے کے بعد غذا میں گوشت یا روٹی کے ریشے اور ریزے تو ضرور ہی دانتوں کے کسی حصّے میں چپکے رہتے ہیں۔ اس سے تیزابی مادّہ پیدا ہو کر دانتوں کے مسالے کو خراب کرتا رہتا ہے اور رفتہ رفتہ دانتوں کے اندر داخل ہو کر اُنھیں کمزور کرتا ہے۔ اسی سے مسوڑھے سوج جاتے ہیں اور دانتوں کی بیماریاں زخم وغیرہ ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ پھر ہم ان بیماریوں کے علاج کے لیے حکیموں، ڈاکٹروں کے پاس جاتے ہیں اور علاج کراتے ہیں، خواہ اِن بیماریوں کا علاج ہو جائے، لیکن ہمیں تکلیف تو اٹھانی ہی پڑتی ہے۔ اس کے علاوہ دانتوں کی خرابی کے بعد علاج ہو کر بھی ہمارے دانتوں کی وہ آب اور مضبوطی باقی نہیں رہتی، جو اس سے پہلے ہوتی ہے۔ اس لیے لازم ہے کہ اپنے دانتوں کی صحت بحال رکھیں اور ان میں کسی قسم کی خرابی اور بیماری پیدا ہی نہ ہونے دیں۔ شروع ہی سے ان کی صفائی میں احتیاط برتنے سے انھیں اپنی درست اور اصلی حالت میں رکھیں، جو بہت آسان ہے۔

دانتوں کی بیماریوں کے علاج میں کئی دفعہ یہ بھی ہوتا ہے کہ اگر ان میں زیادہ خرابی ہو گئی ہے تو دانت نکلوانا بھی پڑتے ہیں اور ان کی جگہ نقلی دانت لگوانا پڑتے ہیں، جو اصلی اور قدرتی دانتوں کی طرح نہ مضبوط ہوتے ہیں اور نہ کھانے کی چیزیں کاٹنے یا چبانے میں اتنا مزا ہی آتا ہے، جو قدرتی دانتوں سے کھانے میں آتا ہے۔

دانتوں کی صفائی اور احتیاط ہمیں بچپن ہی سے کرنا چاہیے، کیوں کہ کم عمری میں دانت زیادہ مضبوط بھی نہیں ہوتے، ان کو گندہ رکھنے سے بیماریاں جلدی اپنا گھر بناتی ہیں۔ گندے منھ سے بدبو بھی آتی ہے۔ لوگ ایسے بچوں کو اپنے قریب بٹھا کر بات تک کرنا پسند نہیں کرتے، کیوں کہ ان کے گندے دانتوں اور منھ کی بدبو سے گھن آتی ہے۔ یہ سوچنے کی بات ہے کہ دانتوں کی حفاظت نہ کرنے سے ایک طرف تو دُکھ درد کی تکلیف کا ڈر، طرح طرح کی بیماریوں کا اندیشہ ہے اور ساتھ ہی گندے دانت اور منھ کے ساتھ دوسروں کے پاس بیٹھنے کے قابل بھی نہ رہے۔ کتنی عجیب بات ہے۔ ذرا سی بے احتیاطی سے دانتوں کی دیکھ بھال نہ کرنے کی وجہ سے کیا کیا مصیبتیں بھگتنا پڑتی ہیں۔ تم نے دیکھا دانتوں سے غفلت برتنا کتنا بڑا جرم ہے، جس کی کیسی بھاری سزا ملتی ہے۔



حرفاً مولا

ہمارے نبیٔ برحق حضرت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، "حرفاً مولا"، یعنی (جس نے تمھیں) ایک حرف پڑھایا (وہ تمھارا) مولا (آقا یا مالک ہے)۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام میں استاد کا مرتبہ کتنا بلند ہے۔

اُستاد طالب علم کو علم و ادب سکھا کر اس کی زندگی سنوارنے کے قابل بناتا ہے۔ شاگرد اُستاد کی جتنی بھی عزت اور ادب کریں ضروری ہے۔ مسلمان استادوں کی خدمت ہی کو اپنی عظمت سمجھتے تھے۔ پُرانے زمانے میں مسلمان بادشاہ اور خلیفہ تک اپنی اولاد (شہزادوں) کو اسلامی طریقے سکھاتے تھے اور شہزادے بھی اپنے بزرگ اُستادوں کی ہر طرح عزت اور خدمت کرنا اپنا فرض سمجھتے۔

ہم آپ کو قدیم مسلمان بادشاہوں اور ان کے شہزادوں کے چند ایسے قصے سناتے ہیں جن میں استادوں کی شان اور بڑائی کا حال ملتا ہے اور ثابت ہوتا ہے کہ جن شہزادوں نے اپنے استادوں کا سب سے زیادہ ادب اور عزت کی وہ بڑے ہو کر اپنی بادشاہت یا خلافت کے زمانے میں اتنے ہی زیادہ شان شوکت اور عظمت کے مالک بنے۔

ایک مرتبہ بغداد کے خلیفہ ہارون رشید

کا شہزادہ مامون رشید ولی عہدی کے زمانے میں ایک عالم فاضل بزرگ مولانا ابو محمدؒ سے تعلیم حاصل کیا کرتا تھا۔ مولانا شاہی محل آیا کرتے اور شہزادے کو پڑھاتے۔ ایک دن مولانا سبق پڑھانے آئے اور انھوں نے شاہی خدمت گار کو محل کے اندر بھیجا کہ شہزادے کو بلا کر لائے۔ خدمت گار محل میں گیا اور اس نے آکر کہا کہ شہزادے صاحب آرام میں ہیں۔ مولانا نے پھر کہا کہ جاؤ اور انھیں اطلاع دو کہ ہم آئے ہیں اور یہ وقت شہزادے کی تعلیم کا ہے، آرام کا نہیں ہے، لیکن خدمت گار کے دوبارہ اطلاع دینے پر بھی شہزادہ مامون کو شاہی مکتب میں آنے میں دیر ہوئی۔ مولانا کو یہ بات بہت ناگوار گزری۔ بعض خادم، جو مولانا کو خوش کرنا چاہتے تھے اور شہزادے سے کسی وجہ سے خفا تھے، لگائی بجھائی کرنے لگے کہ شہزادہ بہت مغرور اور بے ادب ہو گیا ہے۔ وہ سب شاہی ملازموں سے بھی بُرا سلوک کرتا ہے۔ مولانا ان باتوں کو سن کر اور بھی زیادہ ناراض ہوئے۔

کچھ دیر بعد جب مامون رشید مکتب میں آیا تو مولانا نے جو پہلے سے ہی بگڑے بیٹھے تھے کچھ پوچھے بغیر بید لے کر شہزادے کو پیٹنا شروع کر دیا۔ شہزادہ رونے لگا۔ اتنے میں خلیفہ ہارون رشید کا وزیر جعفر برمکی وہاں آپہنچا۔ شہزادے نے اسے دور سے آتا دیکھ کر جلدی جلدی اپنے آنسو پونچھے اور آنکھیں صاف کیں کہ جعفر برمکی کو یہ معلوم نہ ہو کہ مولانا نے شہزادے کو پیٹا ہے۔ جعفر برمکی کو مامون رشید سے کوئی خاص بات کہنا ہوگی، وہ شہزادے کو علیحدہ لے گیا اور چپکے چپکے کچھ باتیں کیں۔ مولانا کو شبہ ہوا کہ شہزادے نے وزیر سے میری شکایت کی ہوگی۔ انھوں نے وزیر کے چلے جانے کے بعد پوچھا کہ، "تم نے وزیر سے میری شکایت کی ہے؟" شہزادے نے کہا، "حضرت! میں یہ گستاخی کبھی نہیں کر سکتا۔ آپ نے جو سزا مجھے دی وہ کسی ذاتی بھلائی یا میری دشمنی سے نہیں تھی، اس میں میری ہی بھلائی تھی، اس لیے میں ایک قصور کے بعد غلط شکایت کا قصور کر کے گناہ گار کیوں ہوتا۔ میری یہ مجال نہیں۔ وزیر تو کیا میں خلیفۃ المسلمین (اپنے والد) کو بھی کبھی ایسی بات نہیں بتا سکتا۔ مجھے حسبِ معمول آپ کی تشریف آوری سے پہلے مکتب میں حاضر ہونا چاہیے تھا۔ مجھ سے غلطی ہوئی۔ میرے دیر سے آنے کی وجہ سے آپ کو تکلیف ہوئی، اس کی معافی چاہتا ہوں۔ میں آپ کی اس سختی کو ماں باپ کے پیار شفقت سے کہیں بہتر سمجھتا ہوں۔"

مولانا نے شہزادے کو دعائیں دیں اور خوش ہو کر اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔ انھیں یہ بھی یقین ہو گیا کہ ملازموں نے شہزادے کی جھوٹی چغلی کھائی تھی۔ شہزادے کا اخلاق ہر گز کسی سے بدسلوکی کا روادار نہیں ہو سکتا۔

اسی کا نتیجہ یہ تھا کہ مامون رشید خلیفہ ہوئے تو ان کی حکومت دنیا بھر میں شاندار مشہور ہوئی۔ شفیق استاد نے ان کو علم و فضل کے جوہر سے ایسا آراستہ کیا کہ رعایا کی خوش حالی اور سلطنت کی بحالی کے لیے خلیفہ نے عظیم الشان کارنامے انجام دیے اور علم و حکمت اور بہتری و بہبودی کے لیے ان کا نام زمانہ میں آفتاب بن کر چمکا۔

اسی طرح ایک مرتبہ خلیفہ ہارون رشید نے مامون رشید اور ان کے بھائی کو استاد کا ادب اور خدمت کرتے دیکھ کر اس قدر فخر اور خوشی ظاہر کی کہ بھرے دربار میں امیروں وزیروں سے اس کا چرچا کیا۔ ہوا یہ کہ ایک دن خلیفہ شاہی محل میں شہزادوں کے مکتب کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ ان کی نظر پڑی تو سامنے دونوں شہزادے اپنے استاد مولانا محمد صاحب کی جوتیاں سیدھی کر کے ان کے سامنے رکھ رہے ہیں اور مولانا دونوں شہزادوں کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے جوتیاں پہن رہے ہیں۔ خلیفہ کے لیے یہ منظر بہت ہی عجیب تھا۔ وہ دربار میں پہنچے اپنے وزیروں اور امیروں کو مخاطب کر کے سوال کیا، "آپ لوگوں کے نزدیک دنیا کا سب سے خوش نصیب آدمی کون ہے؟" سب نے ایک زبان ہو کر جواب دیا، "امیر المومنین، خلیفۃ المسلمین سے زیادہ دنیا میں کوئی خوش نصیب نہیں۔"

خلیفہ نے فرمایا، "نہیں، آپ لوگوں نے صحیح اندازہ نہیں کیا۔" اور پھر جو کچھ دیکھ کر آئے تھے اس کا حال بتا کر کہا:

" دنیا کا خوش نصیب انسان وہ ہے، جس کی جوتیاں شہزادے سیدھی کرتے ہیں۔ یہ مرتبہ اللہ تعالیٰ نے اس کو علم و فضل کی بدولت بخشا، جس کی شان اور دولت دنیا کی ظاہری دولت اور سلطنت سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے اور وہ شہزادے بھی کچھ کم خوش نصیب نہیں ہیں، جنھیں اپنے استاد کی جوتیاں سیدھی کرنے کی خدمت کا فخر نصیب ہوا اور استاد کا دستِ شفقت ان کے سر پر رکھا جائے۔ وہ اُستاد کی خوشنودی سے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کریں گے اور علم و فضل سے بڑے بڑے درجے پائیں گے۔"

تمام درباری خلیفہ کی زبانی یہ باتیں سن کر حیران رہ گئے اور شہزادوں کے اخلاق اور استاد شاگرد کے ان خوش گوار تعلقات کی تعریف کرنے لگے۔



لالچ کی ناؤ

ایک گاؤں میں لکڑہارا رہتا تھا۔ ہر صبح کو وہ جنگل جاتا، لکڑیاں کاٹتا، شام کو شہر جاکر اپنی لکڑیاں بیچ کر واپس گھر آجاتا۔ اس طرح وہ اپنا اور اپنے بیوی بچّوں کا پیٹ پالتا تھا۔ ایک دن وہ روز کی طرح شام کو لکڑیاں بیچ کر گھر واپس آرہا تھا کہ ایک فقیر راستے میں ملا۔ اُس نے اِس سے کہا، "میں کئی دن کا بھوکا ہوں۔ خدا کی راہ میں کچھ دے دو۔" لکڑہارے کو فقیر پر ترس آگیا۔ جو پیسے اُس نے لکڑیاں بیچ کر لیے تھے، سب فقیر کو دے کر گھر واپس چلاگیا۔ لکڑہارے کی بیوی نے پیسے مانگے کہ کھانے پینے کا سامان آنا ہے تو اُس نے بیوی کو سارا حال بتادیا۔ اُس کی بیوی بھی نیک تھی، وہ خاموش ہوگئی۔ بچّے رودھو کر بھوکے سوگئے۔ صبح صبح لکڑہارا

پھر جنگل کو لکڑیاں کاٹنے چلا گیا۔ جب شام کو لکڑیاں کاٹ کر گھر واپس آ رہا تھا تو پھر وہی فقیر راستے میں ملا اور اُس نے کہا، "خدا تیرا بھلا کرے، میں بھوکا اندھا ضعیف ہوں مجھے کچھ مولا کی راہ پر دے جا۔" اُس لکڑ ہارے نے جو پیسے لکڑیاں بیچ کر حاصل کیے تھے، پھر اُس فقیر کو دے دیے اور گھر چلا گیا۔ جس وقت اُس کی بیوی نے پیسے مانگے تو لکڑ ہارے نے کہا، "بیوی، آج پھر وہ فقیر مجھے ملا تھا، مجھے اُس کی حالت پر بڑا ترس آیا، میں نے پیسے اُس کو دے دیے۔" اس مرتبہ بیوی بہت ناراض ہوئی کہ آج دوسرا دن ہے۔ بچّے فاقے سے ہیں۔ تم ایسے فیاض بنتے ہو۔ اپنے پاس تو کھانے کو نہیں اور دوسروں پر تم رحم کھاتے پھرتے ہو۔ لکڑ ہارا خاموش ہو کر چارپائی پر جا کر لیٹ گیا۔ بچّے روتے رہے۔ صبح کو پھر لکڑ ہارا جنگل کو لکڑیاں کاٹنے نکل گیا اور دل میں ٹھان لی کہ اگر آج فقیر ملا تو اُس کو کچھ نہیں دوں گا۔ تمام دن لکڑیاں کاٹتا رہا۔ شام کو لکڑیاں لے کر شہر گیا۔ لکڑیاں فروخت کر کے واپس آ رہا تھا کہ راستے میں وہی اندھا فقیر اُس کو دُور سے آتا ہوا نظر آیا۔ اُس نے دل سے عہد کر لیا کہ آج میں اس سے بالکل بات نہیں کروں گا۔ لکڑ ہارا یہ سوچ رہا تھا کہ فقیر پاس آ گیا۔ اُس نے صدا لگائی، مولا، تیرا بھلا کرے، مجھ اندھے ضعیف لاچار کو اللہ کی راہ پر کچھ دے۔ لکڑ ہارے نے یہ آواز سُنتے ہی فوراً تمام پیسے نکال کر پھر اُس کو دے دیے۔ اُس دن اندھے فقیر نے کہا، "میں تمھیں آزما رہا تھا۔ تم بہت نیک آدمی ہو۔ تمھاری ایمان داری کا آج تمھیں پھل مل جائے گا۔ آؤ، میرے ساتھ چلو اور اُس خزانے کو نکالو جو ایک ندی کے کنارے دفن ہے۔" لکڑ ہارا فقیر کے ساتھ چل دیا۔ ندی بہت دُور تھی۔ چلتے چلتے رات ہو گئی، تین دن کا بھوکا لکڑ ہارا بڑی مشکل سے ندی کے کنارے پہنچا۔ وہاں جا کر اندھے فقیر نے اپنی لاٹھی پتھر پر خوب زور سے مارنا شروع کی۔ بہت دیر کے بعد پتھر خود بہ خود الگ ہو گیا۔ پھر اُس کو ایک کمرہ نظر آیا۔ لکڑ ہارے کو لے کر اندھا فقیر اندر چلا گیا۔ لکڑ ہارا حیران ہو گیا۔ سونے چاندی کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ اندھے فقیر نے کہا، "جس قدر تم سے اُٹھایا جا سکے لے جاؤ۔ اس میں سے آدھا مجھے دے دینا۔" لکڑ ہارے کو لالچ نے ستایا، اُس نے دل میں سوچا، یہ اندھا اتنی دولت کیا کرے گا۔ اُس نے ایک چھوٹی سی گٹھری میں تھوڑی سی چاندی باندھ کر فقیر کو دے دی اور سونے کا ڈھیر خود لے لیا۔ فقیر نے اس سے کہا، "تم نے کتنا سونا لیا ہے اور مجھے کتنا دیا ہے؟" لکڑ ہارے نے کہا، "آدھا سونا تمھیں دیا ہے اور آدھا آپ لیا ہے۔" فقیر نے کہا، "دیکھو جھوٹ نہ بولو، اس کا نتیجہ بُرا ہوگا۔" لکڑ ہارے نے سمجھا یہ اندھا فقیر یُوں ہی کہہ رہا ہے۔ کیوں کہ اس کو لالچ نے بالکل اندھا کر دیا تھا۔ اُس نے جاتے جاتے اندھے فقیر کو راستے میں چھوڑ دیا اور خود بھاگ گیا۔ فقیر

نے اُسے پکارا، مگر وہ نہ لوٹا تو فقیر نے زور سے چلا کر کہا، "دیکھو تمھیں لالچ کی سزا ملے گی"۔ لکڑ ہارا ہنستا ہوا چلا گیا، فقیر کی کوئی پروا نہ کی اور دولت لے کر خوش خوش اپنے گھر آیا۔ بیوی سے کہا، "لو اب تم دولت مند بن کر عیش کرو" اور یہ کہہ کر گٹھڑی اُس کے سامنے رکھ دی۔ بیوی نے خوشی خوشی گٹھڑی کھولی تو کیا دیکھتی ہے کہ اس میں پتھروں کے ٹکڑوں کے سوا کچھ بھی نہیں۔ بیوی نے اُسے خوب بُرا بھلا کہا کہ مجھے پتھر دے کے دولت مند بنانے کا دھوکا دے رہا ہے۔ اب تو لکڑ ہارے کی آنکھیں کھُلیں اور اُس کی سمجھ میں آیا کہ کسی کو دھوکا دینے اور لالچ میں صرف اپنی بھلائی کے لیے کوشش کرنے کا یہی نتیجہ نکلتا ہے۔ وہ لالچ کی سزا پاکر روتا دھوتا اندھے فقیر کو ڈھونڈھتا پھرا، مگر اب کیا ہوتا تھا۔ اس کی ایمان داری کا جو امتحان لیا گیا تھا، لالچ کے دھوکے میں وہ اس میں ناکام ہو گیا اور عمر بھر پچھتاتا رہا۔



شیخ کا انصاف

سید ابوالانشا



مسٹر جیمس بارٹن اپنے سفرنامے میں لکھتے ہیں "شیخ محمود، ابن موسیٰ کے ساتھ میں شام سے بغداد جارہا تھا۔ شیخ محمود کے کارواں میں نوّے (۹۰) اونٹ تھے۔ شیخ خود ایک سفید گدھے پر سوار تھے۔ اس گدھے سے وہ محبت کرتے تھے۔ اور اس کا بہت خیال رکھتے تھے۔ رات کو وہ شیخ کے خیمے ہی میں باندھا جاتا تھا اور دن میں کسی وقت ان سے جدا نہ رہتا تھا۔ ان کے کارواں میں ۱۹ آدمی تھے۔ وہ سب جاہل اور گنوار تھے۔ شیخ کا حکم ان کے لیے قانون کا درجہ رکھتا تھا۔ وہی ان کو انعام دیتا تھا اور وہی سزا دیتا تھا۔

میرے پاس ایک چمڑے کے ہینڈ بیگ میں اسّی سونے کے سکّے تھے۔ ان کو میں بڑی

حفاظت سے رات کو اپنے خیمے میں رکھتا تھا۔ ہر روز صبح کو میں بیگ میں ہاتھ ڈال کر دیکھ لیتا تھا کہ وہ محفوظ ہیں۔ نویں دن صبح کو میں یہ دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا کہ میرے چمڑے کا بیگ غائب ہے۔

میں فوراً ابن موسیٰ کے پاس گیا اور اس سے کہا، "شیخ! میں آٹھ روز سے آپ کا مہمان ہوں۔ آپ نے جس شاہانہ انداز میں میری خاطر تواضع کی ہے، اس کا شکریہ ادا کرنے کے لیے مجھے الفاظ نہیں ملتے۔"

شیخ نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے سینے پر رکھے اور کہنے لگے، "ایک عرب کو مہمان نوازی سے جس قدر مسرّت ہوتی ہے، اُتنی اور کسی چیز سے نہیں ہوتی۔"

میں نے اپنی گفتگو جاری رکھی، "آپ کی مہمان نوازی سے مجھے بڑی خوشی حاصل ہوئی ہے، مگر آج ایک ایسا واقعہ پیش آیا، جس نے اس خوشی کو مدّھم کر دیا۔"

اس کے بعد میں نے اُسے اپنے بیگ کے غائب ہونے کا واقعہ بتایا۔ اس نے مجھ سے چند سوالات کیے اور پھر خاموش ہو کر اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کچھ سوچنے لگا، پھر بولا، "آج ہم کیمپ ہی میں رہیں گے۔ کچھ چیزوں کی مرمّت کرنی ہے۔ سورج غروب ہونے سے پہلے انشاءاللہ تمھارا بیگ مع سِکّوں کے مل جائے گا۔"

پھر شیخ نے یہ حکم دے کر کہ اب ہمارے خیمے میں کوئی نہ آئے، خیمے کا پردہ کھول دیا۔ مجھے اپنے سِکّوں کے ملنے کی کوئی امّید نہ تھی۔ تین گھنٹے بعد شیخ اپنے خیمے سے نکلا اور کھانا منگایا۔ کھانا کھانے کے بعد وہ خیمے کے اندر رکھے ہوئے اسباب کے ڈھیر پر چڑھ کر بیٹھ گیا اور مجھے اپنے پاس بٹھالیا، پھر سخت اور درشت لہجے میں اس نے سب آدمیوں کو بلایا اور اُن سب پر اوپر سے نیچے تک نظر ڈالی۔ سب کی آنکھیں بغیر جھپکے اس کے چہرے پر لگی ہوئی تھیں اور سب بے حِس و حرکت کھڑے ہوئے تھے۔ پانچ منٹ تک اس خاموش معائنے کے بعد شیخ نے اپنے جچے تلے الفاظ میں کہا، "آج اس مسافر کے سامنے، جو ہمارا مہمان ہے اور خدائے تعالیٰ کے سامنے میری ذِلّت اور رُسوائی ہوئی ہے۔ چوری انسان اور خدا کی نظر میں بڑا سنگین جرم ہے، لیکن جب اپنے مہمان کا مال چرایا جائے تو وہ جرم ہزار گنا زیادہ سنگین ہو جاتا ہے۔ یہ معزز مسافر مجھ پر اعتماد اور بھروسا کر کے میرا مہمان ہوا تھا۔ اس کو میرے گھر میں لوٹ لیا گیا۔ باہر سے یہاں کوئی آیا نہیں، اس لیے ظاہر ہے کہ

چور میرے سامنے موجود ہے اور سمجھ رہا ہے کہ وہ شیطان کی طرح اپنے جرم کو چھپانے میں کام یاب ہو جائے گا۔ میرا سفید گدھا، جو میرے خیمے میں بندھا ہوا ہے، مقدس براق کی اولاد میں سے ہے، اس میں غیب گوئی کے اوصاف موجود ہیں اور آج تک ایسا نہیں ہوا کہ اس نے صحیح بات نہ بتائی ہو، وہ مجھے بتا دے گا کہ یہ شرم ناک جرم کس نے کیا ہے۔ یہ گدھا ہماری زبان میں بات چیت نہیں کرتا، کیوں اس کا گلا گدھے کا گلا ہے، مگر وہ اپنے مخصوص طریقوں سے مجھے بتا دے گا کہ مجرم کون ہے۔ میں تم کو حکم دیتا ہوں کہ تم ایک ایک کر کے میرے خیمے کے اندر جاؤ۔ خیمے کے اندر جا کر خیمے کا پردہ بند کر لو تاکہ تمھیں سوائے خدا کے اور کوئی دیکھ نہ سکے۔ وہاں پہنچ کر اس گدھے کی دُم پکڑ کر کھینچو۔ جب کِسی بے قصور آدمی کا ہاتھ اس کی دُم کو پکڑے گا تو وہ خاموش رہے گا، لیکن جب چور کا ہاتھ اس کی دُم کو لگے گا تو وہ زور سے ڈھینچوں ڈھینچوں کرنے لگے گا۔ اِس طرح وہ تمھیں بتا دے گا کہ چور کون ہے۔ ہم مجرم کو پکڑ کر قتل کر دیں گے۔"

قطار کے سرے والے آدمی کو سب سے پہلے خیمے کے اندر جانے کا حکم دیا گیا۔ وہ خیمے کے اندر گیا۔ اس کا پردہ بند کیا اور چند سیکنڈ کے بعد واپس آ گیا۔ شیخ نے دوسرے آدمی کو اندر جانے کا اشارا کیا، پھر تیسرے آدمی کو اسی طرح اشارا کیا۔ مَیں گدھے کی ڈھینچوں ڈھینچوں سننے کا انتظار کر رہا تھا اور جو سزا مجرم کو دی جائے گی، اس کا خوف میرے دل پر طاری تھا۔ سولہ آدمی اسی طرح اندر جا جا کر واپس آ گئے اور کوئی آواز وہاں سے بلند نہیں ہوئی۔ میری گھبراہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ سترھواں اور اٹھارواں آدمی بھی خیمے میں جا کر واپس آ گیا۔ انیسواں آدمی اور آخری بھی اسی طرح خیمے کے اندر جا کر واپس آ گیا اور کوئی آواز بھی سُنائی نہیں دی۔ میں سوچنے لگا، چلو تماشا ختم ہوا۔ گدھے نے ہماری کوئی مدد نہیں کی۔

مگر محمُود بن موسیٰ نے بہت آہستہ مجھ سے کہا، "چپکے بیٹھے دیکھتے رہو، تمھارا مال ضرور ملے گا۔"

وہ سب لوگ اسی ترتیب سے بیٹھے، جیسے خیمے میں جانے سے پہلے بیٹھے تھے۔ شیخ نے حکم دیا، "تم سب کھڑے ہو جاؤ اور اپنے ہاتھ سامنے کی طرف پھیلا لو، اس طرح کہ تمھاری ہتھیلیاں اوپر کی طرف رہیں۔"

سب لوگ کھڑے ہو گئے اور ہاتھ آگے

کی طرف پھیلا لیے۔ شیخ اسباب کے ڈھیر پر سے نیچے اترا اور قطار کے سرے والے آدمی کے پاس پہنچا، جو سب سے پہلے خیمے میں گیا تھا اور جھک کر اپنا منھ اس کی ہتھیلیوں پر رکھ دیا۔ وہ اسی طرح تقریباً پانچ سیکنڈ تک اپنا منھ اس کی ہتھیلیوں پر رکھے رہا، پھر دوسرے آدمی کے پاس پہنچا اور اسی طرح اس کی ہتھیلیوں پر اپنا منھ رکھا۔ مجھے بڑی الجھن ہو رہی تھی۔ ہر آدمی کی ہتھیلیوں پر اسی طرح منھ رکھتا ہوا وہ بارھویں آدمی تک پہنچا اور اس کی ہتھیلیوں پر منھ رکھ کر ہٹا لیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر قطار سے علیحدہ کر لیا اور تلوار میان سے نکال لی اور بولا، "ذلیل چور! فوراً بتا کہ ہمارے مہمان کا چمڑے کا بٹوا اور سونے کے سکے کہاں ہیں، ورنہ میں ابھی تیرے ٹکڑے کر ڈالوں گا۔"

وہ آدمی شیخ کے قدموں پر گر پڑا اور رحم کی درخواست کی، پھر وہ جلدی سے اٹھا اور اونٹوں کے دائرے سے باہر جا کر زمین پر سے ایک پتھر ہٹایا اور تھوڑی سی مٹی ادھر کر کے میرا بٹوہ نکال کر لے آیا۔

شیخ نے درشت لہجے میں کہا، "یہ بٹوہ مہمان کو دے دو۔"

جب مجھے بٹوہ ملا تو میں نے دیکھا کہ میرے سب سونے کے سکے اس کے اندر موجود تھے۔

شیخ نے دو آدمیوں کو حکم دیا کہ چور کے کوڑے لگائیں۔ ابھی دو چار کوڑے ہی لگنے پائے تھے کہ میں نے شیخ سے رحم کی درخواست کی اور اس شخص کو چھوڑ دیا گیا۔

میری سمجھ میں کسی طرح نہ آتا تھا کہ چوری کا راز شیخ نے کس طرح معلوم کر لیا۔ اگلے دن جب کارواں روانہ ہوا تو میں نے راستے میں شیخ سے پوچھا کہ مجھے یہ تو بتائیے کہ آپ نے کس طرح چور پکڑا۔ شیخ نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور کہا، "دیکھو، ان لوگوں سے کہنا نہیں، بات یہ تھی کہ گدھے کی دُم پر میں نے بہت سا پودینے کا ست لگا دیا تھا، جو تھوڑی دیر بعد خشک ہو گیا تھا۔ سوائے چور کے ان سب نے گدھے کی دُم پکڑ کر کھینچی تھی۔ سب کے ہاتھوں میں پودینے کی خوش بو موجود تھی، صرف چور کے ہاتھوں میں نہیں تھی۔" میں نے جواب دیا، کہا "ماشاءاللہ، ماشاءاللہ۔"



گدھے کی حجامت بنانا پڑی

بہ پروین ایوب

بہت زمانہ ہوا شہر بغداد میں ایک نائی رہتا تھا۔ یہ نائی بہت اچھا کام کرتا تھا، اس لیے اس کا نام بہت مشہور ہو گیا تھا اور یہ اپنی شہرت بڑھتی دیکھ کر لوگوں سے کافی اُجرت مانگتا تھا۔

اس نائی کی دُکان پر بڑے بڑے دولت مند حجامت بنوانے آیا کرتے تھے، اس لیے نائی کا دماغ آسمان پر پہنچ گیا تھا۔ وہ بہت مغرور ہو گیا تھا۔

ایک دن اُس نائی کی دکان کے سامنے سے ایک لکڑہارا گزرا۔ وہ ایک گدھے پر لکڑیاں لادے ہوئے جا رہا تھا۔ شام کا وقت تھا لکڑہارے کی لکڑیاں نہیں بکی تھیں، اس لیے وہ بڑا پریشان تھا۔

نائی نے لکڑہارے کو بُلایا اور اس سے دام طے کیے۔ لکڑہارے نے نائی سے تمام لکڑیوں کے چھے آنے مانگے تو نائی نے لکڑیاں لینے سے انکار کر دیا۔

لکڑہارے نے نائی سے کہا، اچھا آپ ہی اس کی صحیح قیمت بتا دیجیے۔ نائی نے تمام لکڑیوں کے چار آنے لگائے اور کہا کہ دینا ہو تو دو ورنہ بھاگ جاؤ۔ بیچارے لکڑہارے نے جو نائی کو غصے میں دیکھا تو عاجزی سے کہنے لگا، "اچھا لائیے چار آنے دے دیجیے اور لکڑیاں لے لیجیے۔" نائی نے لکڑہارے کو چار آنے دے دیے اور کہا لکڑیاں یہاں رکھ دو۔

لکڑہارے نے ساری لکڑیاں نیچے رکھ دیں اور چلنے لگا تو نائی نے کہا کہ سب لکڑیاں دو تم نے سب لکڑیاں نہیں دی ہیں۔ لکڑہارا بہت گھبرایا اور کہنے لگا، "کیسی لکڑیاں؟" اب تو کوئی لکڑی باقی نہیں رہی۔

نائی نے لکڑہارے کے ہاتھ سے پیسے چھین لیے اور کہا ساری لکڑیاں دو گے تب پیسے تمھیں دوں گا، ورنہ یہ لکڑیاں بھی واپس نہیں ملیں گی اور پیسے بھی نہیں ملیں گے۔

لکڑہارے نے گڑگڑا کر کہا، اچھا بھائی بتاؤ تو سہی کون سی لکڑیاں رہ گئی ہیں۔ نائی نے گدھے کی کاٹھی کی طرف اشارہ کیا۔ لکڑہارا کہنے لگا، نہیں، بھلا اس کا جلانے کی لکڑیوں سے کیا تعلق؟" لیکن نائی نے زبردستی لکڑہارے سے کاٹھی چھین لی۔

لکڑہارا بےچارہ روتا ہوا قاضی کے پاس گیا اور قاضی سے اپنا حال کہا۔ نائی بھی لکڑہارے کے پیچھے پیچھے گیا۔ وہ قاضی اس نائی سے حجامت بنواتا تھا، لہٰذا اس نے لکڑہارے کی بات نہیں سُنی

اور اُسے بھگا دیا، پھر لکڑہارا دوسرے قاضی کے پاس گیا اور کہنے لگا کہ حضور، نائی نے مجھ سے لکڑیاں خریدیں اور لکڑیوں کے ساتھ کاٹھی بھی لے لی، لیکن لکڑہارے کی بات قاضی نے نہ مانی اور اُسے بھگا دیا، کیوں کہ اس نائی سے یہ قاضی بھی حجامت بنواتا تھا۔

لکڑہارے نے جب یہ حال دیکھا تو سیدھا خلیفہ کے دربار میں پہنچا۔ وہ خلیفہ بہت انصاف پسند تھا۔ اگر شہر میں کسی مقدمے کا صحیح فیصلہ نہ ہوتا تو وہ مقدمہ خلیفہ کے دربار میں پیش ہوتا اور خلیفہ اُس مقدمے کا صحیح فیصلہ کر دیتا تھا۔ لوگ خلیفہ کے فیصلے سے بہت خوش ہوتے تھے۔ خلیفہ نے لکڑہارے کو اپنے پاس بُلایا اور اُس کے کان میں کوئی بات کہی۔ لکڑہارا خلیفہ کی بات سُن کر خوشی خوشی گھر واپس چلا گیا۔ ایک روز پھر اسی نائی کی دُکان کی طرف سے لکڑہارے کا گزر ہوا۔ لکڑہارے نے نائی کو سلام کیا۔ نائی نے سلام کا جواب دیا، پھر لکڑہارے نے نائی کا مزاج پوچھا۔ نائی نے کہا، "خدا کا شکر ہے ٹھیک ہوں۔"

لکڑہارے نے نائی سے کہا، "میری شادی ہونے والی ہے۔ تم میری اور میرے ساتھی کی خوب اچھی حجامت بنا دو۔ میں تمھیں پوری اُجرت دُوں گا۔" نائی خوش ہو کر کہنے لگا، "مگر میں دو رُپے فی حجامت لُوں گا۔" لکڑہارے نے کہا، "اچھا پہلے تم میری حجامت بنا دو۔ بعد میں میرے ساتھی کی حجامت بنانا۔" اس نے گدھے کو ایک طرف باندھ دیا اور حجامت بنوانے لگا۔ جب اپنی حجامت بنوا چکا تو نائی نے کہا، "اب اپنے ساتھی کو بھی بُلا لو۔" لکڑہارا گیا اور اپنے گدھے کو لے آیا۔ اس بات پر نائی بہت خفا ہوا اور کہنے لگا کہ یہ کیا مذاق ہے؟ کیا تمھارا ساتھی یہ گدھا ہے؟ میں گدھوں کی حجامت نہیں بناتا، آدمیوں کی حجامت بناتا ہوں۔

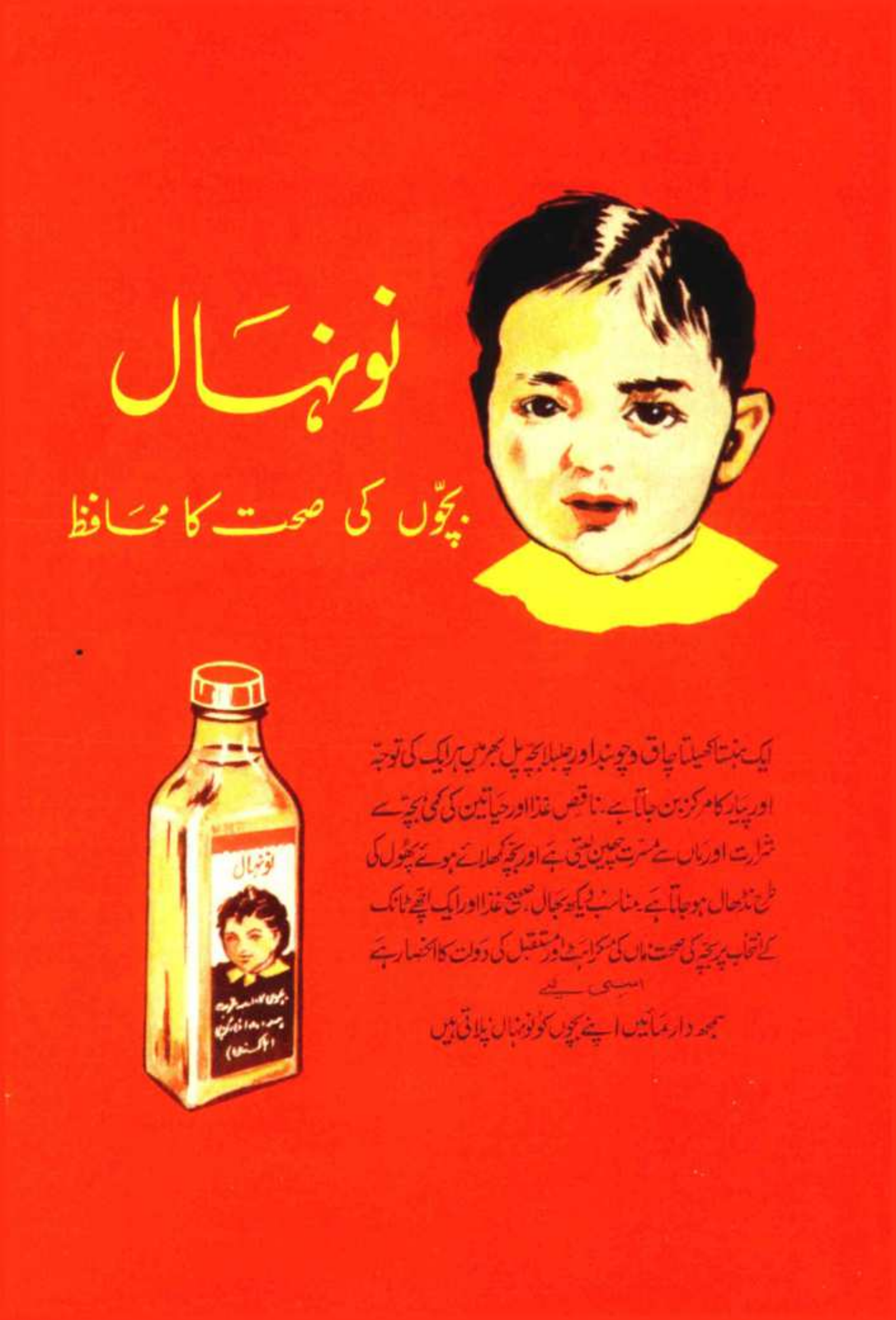
لکڑہارا ہنسنے لگا اور کہا، "اسی لیے میں نے پہلے ہی تم سے وعدہ کرا لیا تھا، اب تو تمھیں میرے ساتھی کی حجامت بنانی ہوگی، ورنہ میں تمھاری شکایت کروں گا۔"

نائی اور لکڑہارے میں بہت دیر تک جھگڑا ہوتا رہا، لیکن معاملہ طے نہ ہوا تو دونوں خلیفہ کے دربار میں حاضر ہوئے۔ خلیفہ نے باری باری دونوں کی باتیں سُنیں، پھر ہنسنے لگا اور نائی سے کہا، "یہ صحیح ہے کہ تم آدمیوں کی حجامت بناتے ہو، گدھے یا جانوروں کی حجامت نہیں بناتے، لیکن یہ بھی تو صحیح ہے کہ لکڑیوں کے ساتھ کاٹھی لینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ تم نے لکڑیوں کی قیمت ادا کی تھی، لکڑیاں لے لیں۔ تمھیں کاٹھی چھین لینے کا کوئی حق نہ تھا۔ تم نے لکڑیوں کے ساتھ کاٹھی بھی لی ہے، لہٰذا اب تم وعدہ خلافی مت کرو۔ تم نے لکڑہارے کے ساتھی کی حجامت بنانے کو کہا تھا۔ اس کا ساتھی گدھا ہے، تمھیں اس کی بھی حجامت بنانی پڑے گی۔"

خلیفہ کا حکم تھا، اس لیے بھرے دربار میں نائی کو گدھے کی حجامت بنانی پڑی۔ اس طرح نائی کی ساری شیخی ختم ہو گئی۔



حیاتین آمیز
سِنکارا
خاندان کے ہر فرد کیلئے ہر موسم میں یکساں مفید
Cinkara
ہمدرد


نونہال
بچوں کی صحت کا محافظ
ایک ہنستا کھیلتا چاق و چوبند اور چلبلا بچہ پل بھر میں ہر ایک کی توجہ
اور پیار کا مرکز بن جاتا ہے۔ ناقص غذا اور حیاتین کی کمی بچے سے
شرارت اور ماں سے مسرت چھین لیتی ہے اور بچہ کمہلائے ہوئے پھول کی
طرح نڈھال ہو جاتا ہے۔ مناسب دیکھ بھال، صحیح غذا اور ایک اچھے ٹانک
کے انتخاب پر بچہ کی صحت ماں کی مسکراہٹ اور مستقبل کی دولت کا انحصار ہے
اسی لیے
سمجھ دار مائیں اپنے بچوں کو نونہال پلاتی ہیں
نونہال

چُن؟ — پاماچُن!

عبداللہ خاور



لاکھوں برس پہلے سے بھی پہلے، ایک بہت بوڑھا فرشتہ زمین پر آبادی کی تیاریاں کرنے کے لیے بھیجا گیا۔ پہلے اس نے زمین تیار کی، پھر سمندر تیار کیا، تب اس نے جان داروں کو پکارا اور کہا، "آؤ اور کھیلو۔" جان داروں نے کہا، "بوڑھے فرشتے ہم کیا کھیلیں؟" فرشتے نے ہاتھی کو پکارا، "اے ہاتھیوں کے دادا ہاتھی تو ہاتھی ہاتھی کھیل۔" ہاتھی، ہاتھی ہاتھی کھیلنے لگا۔ اس کھیل کا مقصد یہ تھا کہ ہاتھی، ہاتھی بن جائے۔ اسی طرح فرشتے نے اود بلاؤ کو بلایا اور کہا، "تو اود بلاؤ اود بلاؤ کھیل۔" گائے سے گائے کا کھیل کھیلنے کو کہا، کچھوے سے کچھوے کا کھیل کھیلنے کو اور اسی طرح تمام جانوروں سے تمام جانوروں کا کھیل کھیلنے کے لیے کہا۔ چنانچہ چوپائے، درندے، چڑیاں، مچھلیاں سب اپنا اپنا کھیل کھیلنے لگے۔

شام کو جب سب جانور کھیلتے کھیلتے تھک گئے تو آدمی آیا۔ (اس کی ننھی سی لڑکی

اس کے کندھوں پر بیٹھی ہوئی تھی ، اس نے کہا ، " بوڑھے فرشتے ، یہ کیسا کھیل مچا ہوا ہے ؟ " بوڑھے فرشتے نے کہا ، " ہو ہو ہو ہو ، آدم کے بیٹے ، یہ دنیا کے آغاز کا کھیل ہے ، مگر تم عقل مند ہو ۔ یہ کھیل تمھارے کھیلنے کا نہیں ہے ۔ تم خود جانوروں کو اپنی مرضی کا کھیل کھلانا ۔ ابھی تو میں ہاتھی کو ہاتھی ، گائے کو گائے . . . . بنا سکھا رہا ہوں ۔ " آدمی نے کہا ، " ہاں ٹھیک ہے ، لیکن تم تمام جانوروں کو میرا فرماں بردار بنانا نہ بھولنا ۔ "

اب پیارے بچو ، جب یہ باتیں ہو رہی تھیں تو کبڑا سمندری کیکڑا ایک چٹان کے پیچھے چپکا سن رہا تھا اس نے اپنے دل میں کہا ، " میں اپنی مرضی کا کھیل ۔ سمندر کی گہرائیوں میں کھیلا کروں گا اور آدمی کا حکم کبھی نہیں مانوں گا " ۔ وہ اپنی باری پر فرشتے کے پاس کھیل سیکھنے نہیں آیا اور کھسک گیا ۔ اسے بھاگتے ہوئے سوائے ننھی لڑکی کے کسی نے نہیں دیکھا ۔

جب فرشتہ تمام جانوروں کو کھیل سکھا چکا تو اس نے اپنے چہرے سے پسینہ پونچھا اور دنیا کا گشت کرنے نکل گیا ، تاکہ یہ دیکھے کہ سب جانور اپنا اپنا کھیل کھیل رہے ہیں یا نہیں ۔ وہ شمال کی طرف گیا ۔ اس نے دیکھا کہ ہاتھی اپنے دانتوں سے زمین کھود رہا ہے اور اپنے پیروں سے برابر کر رہا ہے ۔ اس نے بوڑھے فرشتے سے کہا ، " چُن ؟ " (یعنی کیا میں ٹھیک کھیل رہا ہوں ؟) فرشتے نے کہا ، " پا پا چُن ۔ " (بالکل ٹھیک ہے) اور فرشتے نے ہاتھی کی کھودی ہوئی مٹی کے ڈھیر پر پھونک ماری ۔ وہ ہمالیہ پہاڑ بن گیا ۔ (نقشہ دیکھو ہے کہ نہیں ؟)

فرشتہ مشرق کی طرف گیا ۔ وہاں گائے ایک بڑے میدان میں کھانا کھا رہی تھی ۔ وہ ایک نوالے میں ایک پورا جنگل کھا جاتی اور پھر بیٹھ کر جگالی کرتی ۔ اس نے فرشتے کو دیکھ کر پوچھا " چُن ؟ " فرشتے نے سر ہلا کر کہا ، " پا پا چن " ۔ اور اس نے اس جگہ پھونک ماری ، جہاں گائے جنگل چر چکی تھی ۔ اس طرح سندھ کا ریگستان بن گیا ، عرب اور صحارا کا ریگستان بن گیا ۔ (نقشہ دیکھو ، ہیں کہ نہیں ؟)

فرشتہ مغرب کی طرف گیا ۔ وہاں اود بلاؤ اپنے تیز دانتوں سے لکڑیاں کاٹ کاٹ کر بڑے بڑے دریاؤں کے کنارے پشتے بنا رہا تھا اس نے فرشتے کو دیکھ کر کہا ، " چُن ؟ " فرشتے نے کہا ، " پا پا چُن " اس نے گرے ہوئے درختوں کی شاخوں پر پھونک ماری ، وہ سدا بہار جنگل بن گئے اور جھیلیں بن گئیں ۔ (نقشہ

دیکھو ہے کہ نہیں ؟)

فرشتہ جنوب کی طرف گیا۔ وہاں کچھوا زمین پر اپنے پنجوں سے کھدائی کر رہا تھا اور بڑے بڑے پتھر اچھال رہا تھا۔ وہ پتھر دور سمندر روں میں گر رہے تھے۔ کچھوے نے کہا، "چن ؟" فرشتے نے جواب دیا، "پاماچُن" اور اس نے پتھروں پر پھونک ماری۔ تو خوب صورت جزیرے بن گئے، بورنیو، سلیبس، سماترا، جاوا... (نقشہ دیکھو، ہیں کہ نہیں ؟)

ایک دن فرشتہ دریائے سندھ کے کنارے آدمی سے ملا اور کہا، "ہوہوہوہو، آدم کے بیٹے، کیا تمام زمین تمھارے حکم پر چل رہی ہے ؟"

آدمی نے کہا، "ہاں!"

فرشتے نے کہا، "کیا تمام سمندر تمھارے کہنے پر چل رہے ہیں ؟"

آدمی نے کہا، "نہیں۔ دن میں ایک بار اور رات میں ایک بار سمندر دریائے سندھ تک آجاتا ہے اور میٹھے پانی کو ڈھکیل کر جنگلوں میں پہنچا دیتا ہے۔ میرا گھر بھیگ جاتا ہے اور دن میں ایک بار اور رات میں ایک بار سمندر تمام پانی اپنے ساتھ کھینچ لے جاتا ہے۔ کیچڑ ہی کیچڑ رہ جاتی ہے اور میری ناؤ الٹ جاتی ہے۔ کیا تم نے سمندر سے بھی کھیل کھیلنے کو کہا تھا ؟"

فرشتے نے کہا، "نہیں۔ یہ ایک نیا اور خراب کھیل ہے۔"

اتنے میں سمندر بڑھنا شروع ہوا اور سب طرف پانی ہی پانی ہو گیا۔ بوڑھے فرشتے کو بڑا غصہ آیا اور اس نے آدمی سے کہا، "کشتی نکالو، ہم دیکھیں گے کہ سمندر کے ساتھ کون کھیل رہا ہے!"

کشتی تیار ہوئی۔ فرشتہ بیٹھا اور آدمی بیٹھا اور لڑکی بیٹھی اور کشتی چلی۔

سمندر کا پانی واپس بھاگنے لگا۔ کشتی دوڑنے لگی۔ کراچی سے گزری، بمبئی سے گزری لنکا کے جزیرے سے گزری اور ملکا سے اور سنگاپور سے گزری۔ جیسے کوئی اسے رستے سے کھینچ رہا ہو۔

بوڑھا فرشتہ کشتی میں کھڑا ہو گیا اور زور سے گرجا، "ہو، ہو، اے مچھلیو، چڑیو اور جانورو، تم میں سے کون سمندر کے ساتھ کھیل رہا ہے ؟"

تب تمام مچھلیوں، چڑیوں اور جانوروں نے مل کر کہا، "ہم اور ہمارے بچے اور ان کے بچے وہی کھیل کھیل رہے ہیں جو تو نے سکھایا تھا، مگر سمندر کے ساتھ کوئی نہیں کھیل رہا ہے۔"

اتنے میں بڑا، پورا روشن چاند نکل آیا

فرشتے نے چاند پر رہنے والی کبڑی بڑھیا سے کہا، "کیا تو چرخہ کات رہی ہے؟" اس نے کہا، "ہاں، میں کانٹا بنا چکی ہوں۔ اب ڈور بنا رہی ہوں۔ جب ڈور بن جائے گی تو دنیا کو کانٹے میں پھنسا کر اوپر اٹھا لوں گی۔" فرشتے نے کہا، "بوڑھی شکارن، تو سمندر سے تو نہیں کھیل رہی ہے؟" اس نے کہا، "مجھے فضول کاموں کی فرصت نہیں" اور سوت کاتنے لگی۔

اب پیارے بچو، چاند پر ایک چوہا بھی رہتا ہے، جو بڑھیا کی ڈوری کو اپنے تیز دانتوں سے جلدی جلدی کاٹتا رہتا ہے۔ (اسی وجہ سے بڑھیا کی شکاری ڈور آج تک تیار نہ ہو سکی۔ وہ چوہے کو دیکھ بھی نہیں سکتی، اس کی نظر کمزور ہے۔)

فرشتے نے چوہے سے پوچھا، "ہو۔ چاند کے چوہے۔ تو سمندر سے تو نہیں کھیل رہا ہے؟" چوہے نے چپکے سے کہا، "نہیں، میں بہت مصروف ہوں" اور ڈوری کاٹنے لگا۔

اب لڑکی نے کہا، "بوڑھے فرشتے، جب تم ابا سے باتیں کر رہے تھے تو ایک شریر جانور کھیل سیکھے بغیر چپکے سے بھاگ گیا تھا۔"

فرشتے نے کہا، "ہاہاہا۔ جو بچے خاموش رہتے ہیں اور دیکھا کرتے ہیں وہ کتنے عقل مند ہو جاتے ہیں۔" وہ جانور کیسا تھا؟"

لڑکی نے کہا، "وہ گول تھا اور وہ چپٹا تھا اور اس کی آنکھیں ڈنڈوں پر اگی ہوئی تھیں۔ اس کی پیٹھ پر سخت مضبوط کوٹ تھا اور وہ ایسے ایسے چل رہا تھا۔" یہ کہتے ہوئے لڑکی اپنے باپ کی پیٹھ سے اتری اور کیکڑے کی طرح دائیں بائیں چلنے لگی، "ایسے ایسے۔"

"ہاہاہا۔" فرشتہ ہنسا، "وہ کبڑا کیکڑا ہے۔ لاؤ میں کشتی چلاؤں۔" فرشتہ جلدی جلدی کشتی چلانے لگا، لیکن اسے چلانے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ پانی خوب تیزی سے بہتا چلا جا رہا تھا اور اسی کے ساتھ کشتی۔ (تم ہوتے تو ڈر جاتے۔) کشتی سب جزیروں سے گزرتی وہاں تک پہنچ گئی، جہاں سمندر کا دل ہے۔ اس جگہ کا نام پوپک پاپک ہے۔ وہاں بہت بڑی سرنگ ہے، جو دنیا کے دل تک جاتی ہے اور اس سرنگ میں ایک عجیب درخت ہے۔ اس کا نام پاڑہ جنگی ہے۔ اس درخت پر دو جادوئی ناریل لگتے ہیں۔ اس درخت کے نیچے سرنگ میں بہت دور کیکڑا رہتا تھا۔ فرشتے نے یہاں پہنچ کر پانی میں اپنا لمبا ہاتھ ڈالا۔ ہاتھ اندر گیا اور اندر گیا، اور اندر گیا۔ یہاں تک کہ فرشتے کو کیکڑے کی سخت مضبوط پیٹھ محسوس ہوئی۔ فرشتے کا ہاتھ محسوس کر کے کیکڑا بہت

اندر، بہت اندر گھس گیا اور اس کے گھسنے سے پانی بھر ابل پڑا اور پھیل کر جنگلوں میں دور دور تک بھر گیا۔

فرشتے نے کہا، "اچھا، اچھا۔ اب میں سمجھا کہ سمندر سے کون کھیلا کرتا ہے" اور اس نے زور سے پکارا، "کبڑے کیکڑے، تو کیا کر رہا ہے؟" کبڑے کیکڑے نے گہرائیوں سے جواب دیا، "رات میں ایک بار اور دن میں ایک بار میں کھانے کی تلاش میں نکلتا ہوں مجھے پریشان نہ کرو۔"

فرشتے نے کہا، "سنو، جب تم باہر نکلتے ہو تو سمندر کا تمام پانی سمندر کے دل میں گر جاتا ہے اور تمام دریاؤں کا پانی ختم ہو جاتا ہے اور تمام مچھلیاں مر جاتی ہیں اور ہاتھیوں کے بادشاہ راجہ مویانگ کابان کی ٹانگیں کیچڑ سے سن جاتی ہیں جب تم واپس جا کر غار میں بیٹھتے ہو تو سمندروں کا پانی چڑھتا ہے اور آدھے جزیرے ڈوب جاتے ہیں۔ مگرمچھوں کے بادشاہ کنگ جان ٹبل کے منھ میں نمکین پانی بھر جاتا ہے اور اسے بہت غصہ آتا ہے۔"

کبڑے کیکڑے نے کہا، "مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں اتنا زبردست ہوں۔ اب تو میں اپنے غار سے سات بار نکلا کروں گا اور سمندر کو چین نہیں لینے دوں گا۔"

فرشتے نے کہا، "اب میں تمھیں تمھارا کھیل نہیں سکھا سکتا، کیوں کہ وہ زمانہ گزر گیا، مگر خیر، اگر تم مجھ سے نہیں ڈرتے تو باہر تو آؤ، ذرا باتیں ہی کریں۔"

کبڑے کیکڑے نے کہا، "میں کسی کے باپ سے بھی نہیں ڈرتا۔" یہ کہہ کر وہ سمندر کے اوپر نکل آیا۔ وہ بہت بہت بہت بڑا "کیکڑائے اعظم۔ اس کا ایک سرا امریکا کو چھو رہا تھا اور دوسرا سرا امریکا کو دوسری طرف سے چھو رہا تھا۔ (نقشہ دیکھو۔ خیر ہٹاؤ نہ دیکھو) اور وہ تین آتش فشاں پہاڑوں کے دھوئیں سے بھی زیادہ اونچا تھا۔

فرشتے نے کہا، "کبڑے کیکڑے اگر تو واقعی زبردست ہے تو مجھ پر جادو کر۔ کیکڑے نے آنکھیں نکالیں اپنے بہت سے لمبے لمبے ہاتھ پانی پر مارنے لگا، لیکن نہ پانی ہلا نہ کشتی الٹی، کیوں کہ کیکڑا کیکڑا ہوتا ہے۔ اور فرشتہ فرشتہ ہوتا ہے۔

فرشتے نے ہنس کر کہا، "بس بس، تم بس کیکڑے ہی ہو۔ اب میں عمل پڑھتا ہوں۔" پھر میرے پیارے بچو! فرشتے نے اپنے بائیں ہاتھ کی سب سے چھوٹی انگلی گھمائی اور ایک دم

کیکڑے کی پیٹھ پر سے سخت چٹانی کھال اتر کر گر گئی۔ جیسے گیہوں سے بھوسا نکل جاتا ہے اور کیکڑا نرم اور پلپلا بن کر رہ گیا۔

فرشتہ پھر ہنسا اور بولا، "ہاں بھئی تم تو بڑے زبردست ہو، کیا میں آدمی سے کہوں کہ وہ اپنا بھالا تمھاری پیٹھ میں اتار دے؟ یا کہو تو میں راجہ مویانگ کابان کو بلاؤں۔ وہ اپنے لمبے دانتوں سے تمھیں چھید ڈالے یا کنگ جان بل کو بلاؤں۔ وہ تمھیں کاٹ کھائے۔"

کبڑے کیکڑے نے کہا، "میں بہت شرمندہ ہوں۔ مجھے میری سخت پیٹھ واپس کر دو۔ میں صرف دن میں ایک بار اور رات میں ایک بار شکار کے لیے نکلا کروں گا۔"

فرشتے نے کہا، "نہیں، میں ہرگز ایسا نہیں کروں گا، کیوں کہ بڑے ہونے ہی چلے جاؤ گے اور تم سمندر کے ساتھ کھیلا کرو گے۔"

کیکڑا بولا، "ہائے میں کیا کروں۔ میں صرف پوپک پاپک میں رہ سکتا ہوں۔ اگر میں کہیں اور جاؤں گا تو میری نرم پیٹھ شارک مچھلی اور کتا مچھلی کاٹ کاٹ کر کھائے گی اور اگر غار میں جاؤں تو بھوک سے مرجاؤں گا اور میری پیٹھ باڑہ جنگی کی شاخوں سے زخمی ہو جائے گی۔" یہ کہہ کر وہ اپنے لمبے ہاتھوں سے سینہ پیٹنے لگا اور رونے لگا۔

بوڑھے فرشتے نے کہا، "سن کبڑے کیکڑے میں تجھے وہ کھیل، کھیلنے نہیں دوں گا، جو تو کھیلا کرتا ہے۔ نہ میں تجھے وہ کھیل سکھا سکتا ہوں، جو شروع میں تیرے لیے بنایا گیا تھا، لیکن اگر تو پسند کرے تو میں تیرے اور تیرے بچوں کے لیے ہر سوراخ، ہر سمندری چٹان اور سمندری پودے میں رہنے کے لیے گھر بنادوں۔"

کیکڑے نے کہا، "نہ میں ہاں کر سکتا ہوں نہ نہیں، مگر دیکھو یہ وہی آدمی ہے، جو میری باری پر بیچ میں کود پڑا تھا اور تم سے باتیں کرنے لگا تھا۔ میں انتظار کرتے کرتے تھک گیا اور چپکے سے کھیل سیکھے بغیر بھاگ آیا۔ یہ اس سلسلے میں کیا کہتا ہے؟"

آدمی نے کہا، "میں ایسا جادو کروں گا کہ تم اور تمھارے بچے پانی میں بھی چھپ سکیں گے اور زمین پر بلوں میں بھی رہ سکیں گے۔"

کیکڑے نے کہا، "اب بھی میں ہاں کہہ سکتا ہوں، نہ نہیں۔ دیکھو یہی وہ چھوٹی لڑکی ہے جس نے مجھے بھاگتے دیکھا تھا۔ اگر یہ اسی وقت بول پڑتی تو میں لوٹ آتا اور جو کچھ اب ہو رہا ہے نہ ہوتا۔ وہ میرے لیے کیا کہتی ہے؟"

لڑکی نے کہا، "میرے پاس پھل کاٹنے کے

لیے ایک جوڑی چاقو ہیں۔ اس سے میں ایسا جادو کروں گی کہ تمھارے اور تمھارے بچوں کے ہاتھوں میں چاقو نکل آئیں گے۔ وہ ان سے چیزیں کاٹ کر کھا سکیں گے اور چٹانوں میں چمٹ سکیں گے اور زمین کھود سکیں گے۔"

"مگر میں اب بھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔" کیکڑے نے کہا، "میری سخت پیٹھ مجھے ضرور واپس ملنا چاہیے۔"

فرشتے نے کہا، "اچھا میں پیٹھ بھی دے دوں گا، مگر ایسا جادو کروں گا کہ تم غرور کبھی نہ کرو اور آپے سے باہر نہ ہو۔"

کیکڑا بولا، "اچھا۔ مجھے تم لوگوں کی شرطیں منظور ہیں۔"

تب پیارے بچو، فرشتے نے داہنا ہاتھ اٹھایا اور اس کی پانچوں انگلیوں سے عمل کرنا شروع کیا اور بڑا کیکڑا سکڑنا شروع ہوا اور چھوٹا ہوا اور چھوٹا ہوا۔ اتنا چھوٹا ہو گیا کہ کشتی کے ساتھ تیرتا ہوا ایک ننھا سا کیکڑا رہ گیا اور ننھی آواز سے چلایا، "لڑکی میری قینچیاں دو۔" لڑکی نے تالیاں بجائیں اور کیکڑے کے تیز ڈنک نکل آئے اور وہ انھیں آزمانے کے لیے کشتی سے چپک گیا اور کہنے لگا، "میں ان سے چیزیں کاٹ سکتا ہوں، توڑ سکتا ہوں، پکڑ سکتا ہوں، بل کھود سکتا ہوں، درختوں پر چڑھ سکتا ہوں، گھر بنا سکتا ہوں۔ چُن؟" فرشتے نے کہا، "پاماچُن!" کیکڑا اچلا۔

فرشتے نے کہا، "ایک بات اور سنتے جاؤ۔ تمھاری پیٹھ گیارہ مہینے سخت رہا کرے گی اور ایک مہینے اس کی سخت کھال اتر جائے گی تاکہ تمھیں یاد رہے اور پھر تم غرور نہ کرو۔"

کیکڑے نے کہا، "اس مہینے میں آدمی کے بچے مجھے پکڑیں گے اور میری پیٹھ زخمی کیا کریں گے۔"

آدمی نے کہا، "میرے بچے سمجھ دار ہوں گے وہ تمھیں اور تمھارے بچوں کو نہیں پکڑیں گے اور اگر پکڑیں تو تم میری بیٹی کی دی ہوئی قینچیوں سے ان کے ہاتھ میں کاٹ لینا۔ چُن؟" کیکڑے نے آڑے چلتے ہوئے کہا، "پاماچُن۔"

• جینے کا مزا کام سے ہے۔

(مجلہ آمیل)

• میرے پاس صرف ایک چراغ ہے، جس سے ہدایت حاصل کرتا ہوں۔ وہ چراغ تجربہ ہے۔

(پیٹرک ہنری)

چینی سیّاح ہیئن ٹسانگ

از زبیر احمد

بچّو! اس سے پہلے تم چینی سیاح فاہیان کے سفر کے حالات پڑھ چکے ہو۔ آج میں تمھیں ایک اور چینی سیاح اور راہب ہیئن ٹسانگ کے متعلق کچھ باتیں بتاتا ہوں، جو فاہیان کی موت کے ایک سو سال بعد ہندُستان آیا اور یہاں اس نے کتابوں کے مطالعے، نقل اور ترجمے میں سترہ سال (۶۴۵ - ۶۲۹) بسر کیے۔ تم نے اس کے متعلق بھی اپنی تاریخ کی کتابوں میں پڑھا ہوگا۔ ہندُستان کے متعلق ہیئن ٹسانگ کے لکھے ہوئے حالات اس قدر اہم ہیں کہ ساتویں صدی، یعنی جب وہاں ہرشا وردھن کی حکومت تھی، کی تاریخ اور جغرافیے کا مطالعہ ان کے مطالعے کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ میں اس کے سفر کے حالات بیان کرنا نہیں چاہتا کیوں کہ وہ بجنسہٖ فاہیان کے سفر کے حالات سے ملتے جُلتے ہیں۔ اس کے بعد ایک اور چینی سیاح آئی ٹسنگ بھی ہے، جس کے حالات اتنے عام تو نہیں، لیکن اس کے سفر کے حالات کئی وجہوں سے بہت اہم ہیں۔

ہیئن ٹسانگ کی واپسی پر آئی ٹسنگ نے اس سے ملاقات کی تھی اور اس سے ہندستان کے متعلق بہت سی معلومات حاصل کی تھیں۔ ۶۶۴ء میں وہ ہیئن ٹسانگ کی تجہیز و تکفین میں شریک ہوا اور اسی وقت اس نے ہندستان کی سیاحت کر کے دوسرے سیاحوں کی طرح شہرت حاصل کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔

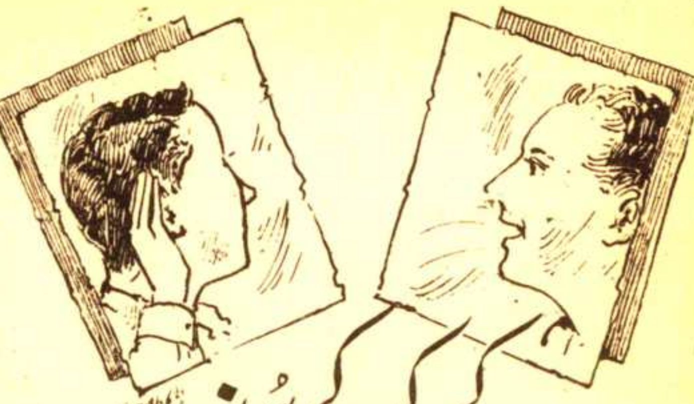
وہ خشکی کے راستے کے بجائے بحرِ چین کے تجارتی راستے سے روانہ ہوا۔ ۶۷۱ء میں وہ یانگ چاؤ کی بندرگاہ سے ایک ایرانی تجارتی جہاز میں روانہ ہوا اور موافق ہوا کی مدد سے ملک سری بھوج (سماترا اور ملایا کے جزیرہ نما کے جنوب میں جو غالباً اس وقت کسی بادشاہ کے ماتحت تھا) پہنچا۔ یہاں اس نے چھے سال تک قیام کر کے سنسکرت سیکھی۔ بادشاہ نے اس کے ادبی اور مذہبی ذوق کی تکمیل میں مدد کی اور وہاں سے ہندُستان جانے کے لیے اس کو اپنی کشتی دے دی، جس میں سوار ہو کر وہ شمال کی طرف روانہ ہو گیا۔ دس دن

کے بعد وہ نیکوبار جزیرے پر پہنچا، جہاں اس زمانے میں کالے رنگ کے ننگے لوگ آباد تھے۔ وہاں سے وہ پندرہ دن میں بنگال کے جنوبی ساحل تمرالپتی پہنچا اور پھر وہاں سے نالندہ کے لیے روانہ ہوا جہاں وہ ۶۷۳ء میں پہنچا۔

یہاں اُس نے دو سال تک مختلف تیرتھ گاہوں کی زیارت کی، پھر دس سال تک نالندہ یونیورسٹی کے اندر مطالعہ اور کتابیں اور مسودے نقل کرنے کی غرض سے گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرتا رہا۔ ۶۸۵ء میں وہ نالندہ سے واپس تمرالپتی روانہ ہوا، جہاں سے کشتی میں بیٹھ کر جزیرہ نما ملایا کے ملک بھوج روانہ ہوگیا۔ اس زمانے میں مالے کے جزیروں میں علم حاصل کرنے کے بہتیرے مراکز تھے اور آئی ٹسنگ یہاں چھے سال سے زیادہ عرصے تک کتابوں کا مطالعہ اور انھیں حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ زندگی کے پچیس سال گھر سے باہر گزارنے کے بعد ۶۹۵ء میں اپنے ملک واپس آیا۔ اس عرصے میں اس نے اپنے ہموطنوں کے لیے چار سو کتابیں جمع کیں، جس میں پانچ لاکھ سے زیادہ اشعار تھے۔

آئی ٹسنگ کے سفرنامے کی اہمیت یہ ہے کہ اس سے ہمیں مالے کے جزیرے میں بدھ مذہب کی اشاعت کے متعلق معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ ہمیں اس کے پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ساتویں صدی کے آخر میں ایک طرف شمالی اور جنوبی ہندستان میں اور دوسری طرف چین اور مالے کے جزیرے میں آزاد تجارت ہوتی تھی۔ ہمیں اس کے سفر کے حالات پڑھنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ برما سے لے کر کوریا کے قریب تک ایشیا کے پورے ساحلی علاقے میں بدھ مذہب کی خانقاہیں اور تعلیم گاہیں موجود تھیں اور ان ملکوں کے رہنے والوں میں ہندستان کے مذہب اور رسم و رواج کی اشاعت ہوتی تھی۔

یہ بات اب معلوم ہوتی ہے کہ سیام، کمبوڈیا، انام، سماترا، جاوا اور مالے ارچی پلگو کے دوسرے جزیروں کے باشندوں کے عقائد اور رسم و رواج پر صدیوں تک ہمارے ملک کا بہت گہرا اثر رہا ہے اور پھر ایک ایسا وقت آئے گا جب ان ملکوں میں ایک نئے اور ترقی یافتہ عقیدے کی اشاعت کے لیے استادوں کی ضرورت ہوگی۔



کچھ کہو کچھ سنو

نظام احمد ـــــ میرپور ڈھاکہ

س: اپنے ملک کا بڑا آدمی بننے کے لیے کیا کرنا چاہیے؟

ج: اپنے ملک کے عوام کی خدمت!

کلیم جے پوری ـــــ لاڑکانہ

س: کیا آپ ہمدرد نونہال میں ڈرامے بھی شائع کرتے ہیں؟

ج: ہم نونہال میں کہانیاں، مضامین ڈرامے اور تمھاری دل چسپی کی سب چیزیں شائع کرتے ہیں۔

ابراہیم محمد آگریا ـــــ کراچی

س: دنیا کی سب سے بڑی لائبریری کس ملک میں ہے؟

ج: کہتے ہیں دنیا کی سب سے بڑی لائبریری ماسکو (روس) میں لینن لائبریری ہے۔ امریکا کی کانگریس لائبریری والوں کا بھی کہنا ہے کہ یہ دنیا کی سب سے بڑی لائبریری ہے

عبدالقادر ـــــ ڈھاکہ

س: کیا ہمدرد نونہال کے تمام مضامین بچوں کے لیے شائع ہوتے ہیں؟

ج: ہمدرد نونہال کے مضامین خاص طور پر بچوں کے لیے ہوتے ہیں، لیکن بڑے بھی ان سے فائدہ

اٹھاتے ہیں۔

رفیق الدین اجمل ـــــ بھاول پور

س: اگر میں کراچی آؤں تو آپ سے ملاقات کر سکتا ہوں؟

ج: ضرور ملاقات کر سکتے ہو۔ ہمیں نونہال پڑھنے والے ہر نونہال سے مِل کر خوشی ہوتی ہے۔

سالم حسین ـــــ دہلی

س: بھیا، بندر کی تصویر ذرا اپنے الفاظ میں کھینچیے؟

ج: کیا تم نے آئینہ نہیں دیکھا؟

غضنفر علی ـــــ ڈنگہ

س: بھیا، کبھی آپ کے اور ردی کی ٹوکری کے درمیان بھی لڑائی ہوتی ہے؟

ج: ہمارے اور ردی کی ٹوکری کے درمیان لڑائی نہیں ہوتی، ہم اس کا روزانہ خوب پیٹ بھر دیتے ہیں، لیکن پھر بھی کبھی کبھی وہ ہم سے ناراض ہو جاتی ہے۔

ارشد زماں ـــــ کراچی

س: امریکا اور روس کے دارالحکومت کا نام تو بتائیے؟

ج: امریکا کے دارالحکومت کا نام "واشنگٹن" اور روس کے دارالحکومت کا نام "ماسکو" ہے۔

انیس الرحمٰن ـــــ پیلی بھیت

س: اگر میں کہانی یا ڈرامہ بھیجوں تو نونہال میں شائع ہو جائے گا؟

ج: اگر تمھاری کہانی یا ڈراما دل چسپ ہوئے تو چھپ جائیں گے۔ "نونہال ادیب" کے صفحات تمھارے ہی لیے ہیں۔

غلام حسین ہاشمی ـــــ پنڈی گھیب

س: اچھی کہانیاں لکھنے کا گُر کیا ہے؟

ج: اچھی کہانیاں پڑھنا اور لکھنے کی مشق کرنا۔

تسلیم الٰہی زلفی ـــــ کراچی

س: عقل مند کی تعریف؟

ج: جو عقل مند کی تعریف پوچھے وہ بھی "عقل مند" ہے۔

مفتی بشیر احمد ـــــ پشاور

س: میں نونہال کا سالانہ خریدار بننا چاہتا ہوں بتائیے کیا کروں؟

ج: بس جلدی سے آٹھ رُپے کا منی آرڈر کر دو۔ رسالہ تمھیں گھر بیٹھے ملتا رہے گا۔



نونہال ادیب

اُستاد کی عظمت

عبداللہ خاں
ٹنڈو آدم



یہ قصّہ خلیفہ ہارون الرشید کے دَورِ حکومت کا ہے، جب عباسی پرچم بغداد کے شاہی قصر پر لہرا رہا تھا، مشرق کے اس عظیم الشان تاجدار سے بڑے بڑے بادشاہ لرزہ براندام تھے۔ قیصرِ روم اسے خراج دے رہا تھا۔ شہنشاہ فرانس اسے تحفے بھیج رہا تھا۔ دُنیا اسے امیرالمومنین ہارون الرشید کے نام سے پکار رہی تھی۔ اسی شہنشاہ کا ایک لڑکا بھی تھا، جس کا نام مامون الرشید تھا۔ باپ نے شروع ہی سے مامون الرشید کی تعلیم و تربیت کا خاص خیال رکھا تھا۔ اُس کے لیے علم و فن کی تعلیم کے ماہر استاد مقرر تھے اور شہزادہ مامون الرشید چھوٹی سی عمر میں مختلف علوم کا ماہر ہو چکا تھا۔ بچپن کا زمانہ تھا، رگ رگ میں

شرارت بھری ہوئی تھی۔ حکومت کا نشہ اس کے علاوہ تھا۔ شہزادہ جب بھی محل سے باہر آتا تھا تو ڈیوڑھی کے غلاموں کا ناک میں دم کر دیتا تھا۔ کسی کی پگڑی اُچھال دی، کسی کی ٹوپی اُڑادی، کسی کے منھ پر تھپڑ مارا، غرض شہزادہ کا باہر آنا قیامت سے کم نہ تھا، غلام بے چارے بے بس و مجبور تھے۔ باپ نے شہزادے کے لیے ایک اتالیق بھی مقرر کر رکھا تھا۔ ایک روز اتالیق کا ڈیوڑھی سے گزر ہوا تو غلاموں نے جرات کر کے اتالیق صاحب کو کہہ ہی دیا کہ جناب ہماری زندگی تو شہزادے کے ہاتھوں اجیرن ہو رہی ہے۔ اتالیق نے کہا کہ قصّہ کیا ہے؟ غلاموں نے ساری کیفیت من وعن بیان کر دی۔ اتالیق جب شہزادے کو پڑھانے گیا تو اُس کو بید سے خوب مارا۔ بچّہ ہی تو تھا رونے لگا۔ اتالیق نے کہا، کہ ابھی سے تم اتنی شرارت کرتے ہو۔ جب بادشاہ بنو گے تو خلقِ خدا کو جینے بھی نہیں دو گے۔ شہزادہ درد کی شدّت سے رو رہا تھا۔ اتالیق شہزادے کو اسی حالت میں چھوڑ کر چل دیا۔ کچھ دیر بعد جعفر برمکی جو وزیرِاعظم تھے، وہاں سے گزرے تو شہزادہ ابھی تک رو رہا تھا۔ وزیر کو سامنے سے آتے ہوئے دیکھا تو جھٹ آنسو پونچھ کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ وزیر نے شہزادے کی مزاج پُرسی کی اور چلا گیا۔ شہزادے نے اس بات کا اظہار ہی نہ ہونے دیا کہ ابھی پِٹ چکا ہے۔ دوسرے دن جب اتالیق صاحب تشریف لائے تو انھوں نے شہزادے سے پوچھا کہ کل جس وقت میں یہاں سے واپس جا رہا تھا تو جعفر ادھر ہی آ رہے تھے، تم نے ان سے میری شکایت تو نہیں کی؟" مامون الرشید نے کہا، "استغفراللہ! آپ نے عجیب بات کہی، میں نے حضرت امیرالمومنین کو بھی اس بات کا علم نہ ہونے دیا تو وزیر صاحب سے کیوں کہتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ نے کل جو سزا مجھے دی وہ صرف میری اصلاح کی غرض سے تھی اور اب میں نے اس بات کا عہد کر لیا ہے کہ پھر کبھی اس قسم کی شرارت نہیں کروں گا۔"

پیارے نونہالو! تمھیں پتہ ہے کہ وہ بڑا ہو کر کتنا عادل بنا، یہ تمھیں دوسری بار بتاؤں گا۔ تمھیں بھی چاہیے کہ اپنے اُستاد کے خلاف شکایت نہ کرو۔

تارے

جہانگیر احمد ظہیر
ڈیرہ غازی خاں



اَے ننھّے منّے تارو!
اَے آنکھ کے دُلارو
کِتنے چمک رہے ہو
کتنے دَمک رہے ہو
تم آسماں کے راہی
تم پر نہیں سیاہی
مُکھڑا ہے کِتنا پیارا
پھولوں کا ہے نظارہ
تم پاس آؤ میرے
کر جاؤ یاں کے پھیرے
اَپنا دِکھا کے چہرہ
بہلا دو دِل تو میرا
مُکھڑا دِکھا کے پھر تم
ہو جانا رات میں گُم
اَے ننھّے مُنّے تارو
اَے آنکھ کے دُلارو

بدلہ

محمد عرفان
کراچی



امتحان ہو رہے تھے اور سلیم نے محنت بہت کی تھی اور اس کے پاس ہونے کی پوری اُمید تھی۔ اسلم ایک کھلنڈرا لڑکا تھا، اس لیے اس کے کامیاب ہونے کی اُمید نہ تھی۔ نتیجے کا دن بھی آ پہنچا۔ سلیم فرسٹ ڈویژن پاس ہوا اور اسلم فیل ہو گیا۔ اسلم کے دل میں حسد تھا۔ وہ سلیم سے جلنے لگا اور اس تاک میں رہنے لگا کہ کسی طرح سلیم کو نقصان پہنچائے۔ آخر ایک پروگرام کے مطابق سلیم، اسلم اور ماجد نے ایک ٹیکسی کرائے پر لی اور پکنک منانے کے لیے ایک پُر فضا مقام پر پہنچے۔ پکنک خوب اچھی طرح ہوئی۔ اب اسلم نے ماجد کو اشارے میں کچھ کہا، پھر ماجد سلیم کے پاس آیا اور کہنے لگا "سلیم، ذرا سامنے والے حوض سے پانی لے آنا۔ سلیم نے جگ لیا اور

حوض سے پانی بھرنے کے لیے چلا گیا۔ حوض چوں کہ گہرا تھا اور پانی بھی کم تھا، اس لیے سلیم کو بہت جھکنا پڑا۔ جب سلیم پانی بھر رہا تھا تو اسلم نے سلیم کو حوض میں دھکّا دے دیا، سلیم اچانک دھکے سے سنبھل نہ پایا اور حوض میں جا گرا، سلیم کو چوٹ زیادہ تو نہ آئی، لیکن وہ حوض سے باہر نہ نکل سکتا تھا، کیوں کہ حوض گہرا تھا اور پانی بھی کم تھا۔

اسلم اور ماجد خوش تھے کہ انھوں نے اپنے سامان باندھے اور ٹیکسی لے کر گھر روانہ ہوئے۔ جب وہ گھر جا رہے تھے تو اُن کی ٹیکسی ہوا سے باتیں کر رہی تھی۔ یہ خوش تھے اور گھر جانا چاہتے تھے، لیکن اتفاق سے اُن کی ٹیکسی کے بریک ٹوٹ گئے۔ ٹیکسی ہوا سے باتیں کر رہی تھی اور سامنے سے ایک ٹرک آ رہا تھا۔ اچانک ایک دھماکہ ہوا اور ٹیکسی کی ٹکر ٹرک سے ہو گئی۔ ٹیکسی آگے سے چُور چُور ہو گئی اور اسلم کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ ڈرائیور کے معمولی چوٹ لگی، کیوں کہ وہ اُچھل کر باہر جا گرا تھا اور ماجد کے ہاتھ میں بھی چوٹ لگی۔ ماجد، اسلم اور ڈرائیور کو ٹرک میں بٹھا کر اسپتال لے جایا گیا۔ ماجد سے پتہ پوچھ کر اُن کے گھر فون کیا گیا۔ سلیم کے گھر اطلاع نہ گئی اور نہ ہی سلیم کے گھر والوں کو پتہ چلا۔

ادھر سلیم نے ایک دو آوازیں دیں کہ شاید کوئی راہ گیر مجھے نکال دے۔ ایک آدمی جو وہاں سے گزر رہا تھا، آواز سُن کر حوض کے قریب آیا اور جھانکا تو ایک لڑکا پانی میں پڑا تھا۔ اُس نے سلیم کو حوض سے باہر نکالا اور جب اُس نے چوٹیں دیکھیں تو اُسے اسپتال لے گیا۔ کچھ دنوں کے بعد وہ ٹھیک ہو گیا۔ پھر کچھ دنوں کے بعد سلیم نے اسلم کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں بیساکھی تھی۔ اسلم نے سلیم سے کہا،

"سلیم بھائی! مجھے معاف کر دو، میں نے تمھیں حوض میں دھکّا دیا تھا اس کا بدلہ مجھے مل گیا۔"

سلیم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اُس نے کہا،

"معافی تو مجھے مانگنی چاہیے کیوں کہ میری وجہ سے تمھیں یہ مصیبت جھیلنی پڑ رہی ہے۔"

بُک پوسٹ

رفیق الدین اجمل
بہاول پور

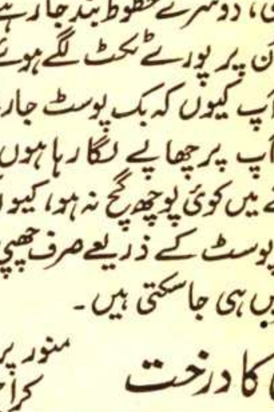


ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک سادہ لوح دیہاتی تھا۔ اُسے لاہور جانے کا بڑا شوق تھا۔ جب وہ اسٹیشن پر پہنچا تو بکنگ آفس سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اُس کے پاس آدھا کرایہ ہے۔ پہلے تو بڑا پریشان ہوا، پھر بڑی معصومیت سے کہنے لگا، "اگر میرے پاس آدھا کرایہ ہے تو کیا ہوا میں بک پوسٹ چلا جاؤں گا۔" بکنگ بابو نے سمجھا، کہ یہ پاگل ہے، لہذا اُس نے دیہاتی سے کہا کہ "بھئی یہاں پر بک پوسٹ نہیں ہوتا ہے۔ آپ ڈاکخانے چلے جائیں، وہاں پر بک پوسٹ ہو سکتا ہے۔" اس طرح اُس نے اپنی جان چھڑائی۔ بے چارہ دیہاتی ڈاک خانے پہنچا، سات پیسے کا ٹکٹ لیا اور اسے اپنے ماتھے پر چسپاں کر کے لیٹر بکس کی طرف گیا۔ کافی دیر چھپ کر کھڑے رہنے کے بعد اُس نے سوچا کہ مجھے ایسی حالت میں یہاں پر کھڑا دیکھ کر لوگ شک کریں گے، بہتر یہی ہے کہ میں اپنا سر لیٹر بکس کے اندر ڈال دوں۔ اس خیال کے آتے ہی اُس نے ایسا ہی کیا۔ جب پوسٹ مین خطوط نکالنے کے لیے لیٹر بکس کی طرف آیا، تو یہ نظارہ دیکھ کر پہلے تو ہنسا، پھر خیال کیا شاید کوئی پاگل ہوگا۔ پھر بھی احتیاطاً دریافت کیا کہ بھائی، "کیا ارادہ ہے۔" یہ سُننا تھا کہ دیہاتی لگا صلواتیں سُنانے۔ بھئی، میں نے لاہور جانے کے لیے پیسے خرچ کیے ہیں، لہذا کسی کا حق نہیں ہے کہ مجھ پر نکتہ چینی کرے۔ اب تو پوسٹ مین کو پورا یقین ہو گیا کہ اس کو سات نمبر بس پر سوار کرانا چاہیے۔ دیہاتی دل ہی دل میں بڑا خوش ہوا۔ جب تمام خطوط پر مہریں لگ چکیں تو دیہاتی بڑے مزے سے بولا، "بھائی مجھے بھی مہر لگا دو، تاکہ راستے میں کوئی تکلیف نہ ہو۔" پوسٹ مین نے موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے دیہاتی پر جوتے برسانے شروع کر دیے۔ جب دیہاتی کافی مار

کھا چکا تو چلّا اُٹھا، ارے ٹھہرو! آپ نے دوسرے خطوں پر تو ایک بار مہر لگائی ہے لیکن مجھ پر تیس چالیس مہریں لگا دیں۔ پوسٹ مین نے جواب دیا، بھائی، دوسرے خطوط بند جا رہے ہیں اور اُن پر پورے ٹکٹ لگے ہوئے تھے اور آپ کیوں کہ بک پوسٹ جا رہے ہیں، لہٰذا آپ پر چھاپے لگا رہا ہوں، تاکہ راستے میں کوئی پوچھ گچھ نہ ہو، کیوں کہ بُک پوسٹ کے ذریعے صرف چھپی ہوئی چیزیں ہی جا سکتی ہیں۔

اِملی کا درخت

منور پروین
کراچی

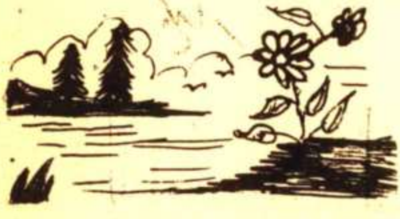


املی کا ایک پُرانا درخت تھا۔ اس کی کچّی املی، پتّا یا ٹہنی جو چیز توڑی جاتی، اندر سے سُرخ سُرخ خون نکلتا۔ جاہل اس کا پتّا توڑتے ہوئے ڈرتے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ اس کی پُوجا کرنے لگے۔ روزانہ سینکڑوں آدمی پیڑ کے سامنے جُھکتے اور اپنی مرادیں مانگتے تھے۔ ایک بزرگ نے دل میں سوچا کہ ناحق مخلوقِ خدا گمراہ ہو رہی ہے۔ میں کیوں نہ اس درخت کو جڑ سے کاٹ دوں۔ وہ اس ارادے سے کلہاڑا لے کر گھر سے نکلا۔ راستے میں ایک شخص ملا، جس نے دریافت کیا، "آپ کہاں جا رہے ہیں؟" اُنھوں نے کہا، "املی کا درخت کاٹنے جا رہا ہوں"۔ اس نے کہا، "اس میں آپ کا کیا فائدہ ہے"۔ بزرگ نے جواب دیا "میرا کوئی فائدہ نہیں، مخلوقِ خدا اس کی پوجا کرتی ہے، لوگ گمراہی سے بچ جائیں گے"۔ اس شخص نے کہا، "میں کوئی ایسی تدبیر بتاؤں، جس میں آپ کا فائدہ ہو تو اس کو آپ مان لیں گے"۔ بزرگ نے فرمایا کہیے۔ وہ شخص بولا، "آپ درخت کاٹنے کا ارادہ چھوڑ دیجیے۔ روزانہ ۲ رُپے آپ کو صبح تکیے کے نیچے مل جایا کریں گے"۔ بزرگ نے دل میں سوچا، دو رُپے روزانہ ملیں گے تو اطمینان سے خرچ چلے گا۔ کسی طرح کی فکر نہ رہے گی۔ وہ واپس لوٹ آئے اُنھیں روزانہ دو رُپے تکیے کے نیچے سے

صبح کو مل جاتے تھے، دو ڈھائی مہینے یہی سلسلہ رہا، پھر ایک روز تکیہ اُٹھایا تو اس کے نیچے رُپے نہیں تھے۔ اس نے سوچا، شاید کل چار رُپے مل جائیں، مگر جب دوسرے تیسرے چوتھے روز بھی تکیے کے نیچے سے کچھ نہیں نکلا تو انھوں نے پھر کلہاڑا اُٹھایا اور املی کا درخت کاٹنے چل دیے۔ راستے میں وہی آدمی اُسی جگہ پھر ملا۔ اس نے کہا، "بڑے میاں، کہاں جا رہے ہو؟" انھوں نے جواب دیا، "املی کا درخت کاٹنے جا رہا ہوں۔" اس نے ترش روئی سے کہا، "خبردار، درخت کی طرف گئے تو زمین پر پٹک دُوں گا۔" انھیں بہت تعجب ہوا۔ پوچھا، "اچھا، یہ تو بتاؤ پہلے تم خوشامد کے ساتھ پیش آئے تھے اور دو رُپے روز کی پیش کش تھی، آج اس قدر خفا کیوں ہو۔ اس نے کہا، "شیخ صاحب سُنو! میں شیطان ہوں۔ اس وقت آپ اللہ کے واسطے درخت کاٹنے نکلے تھے۔ اگر نہ بھی کاٹتے تو آپ کا کچھ نہیں کر سکتا تھا، کیوں کہ پانچ سو فرشتے آپ کے ساتھ تھے، آج آپ دو رُپے کے واسطے آئے ہیں اور کوئی فرشتہ آپ کے ساتھ نہیں۔ میں آپ کو ابھی پچھاڑ دوں گا۔ یہ اپنا سا منھ لیے ہوئے واپس آگئے۔

بہار آئی

جاوید اطہر
کراچی



چمن میں بلبل چہک رہی ہے
گلوں سے خوشبو مہک رہی ہے
ڈالی ڈالی لہک رہی ہے
روش روش بھی سجی ہوئی ہے بہار آئی بہار آئی
ہری سی چادر بچھی ہوئی ہے
شفق پہ مہندی رچی ہوئی ہے
درخت کپڑے بدل رہے ہیں بہار آئی بہار آئی
زمیں سے چشمے اُبل رہے ہیں
خوشی سے غنچے مچل رہے ہیں
ہوائیں چلنے لگیں خراماں بہار آئی بہار آئی
شفق ہے تاباں نظر ہے حیراں
ہر ایک بے جاں میں آگئی جاں
فضا معطر، ہوا معطر بہار آئی بہار آئی
مسرتوں کی بارات لے کر
یہی ہے جاوید ہر ایک زباں پر بہار آئی بہار آئی

ظالم بادشاہ

محمد حنیف بیگ تبسم
ملتان



کہتے ہیں کہ کسی ملک میں ایک بادشاہ حکومت کرتا تھا، جو بہت بے رحم اور ظالم تھا۔ وہ بعض اوقات بے گناہوں کو بھی قتل کرا دیا کرتا تھا۔ اُس کی رعایا اُس سے بہت ڈرتی تھی اور خدا سے دُعا مانگتی تھی کہ وہ انھیں اس ظالم بادشاہ کے عتاب سے محفوظ رکھے۔

اس بادشاہ کا نام بطلیموس تھا۔ اس کا ایک بیٹا تھا، جس کا نام شہزادہ خرم تھا۔ یہ بادشاہ عیش و عشرت میں پڑ چکا تھا۔ وہ ہر وقت شراب کے نشے میں رہتا اور شہزادہ خرم اس کی یہ حالت دیکھ کر اُسے دل ہی دل میں کوستا، لیکن کچھ کر نہ سکتا تھا۔

ایک مرتبہ بادشاہ شکار کھیلنے گیا ہوا تھا، حکومت کی باگ ڈور وزیر کے ہاتھ میں تھی، شہزادہ خرم نے چاہا کہ وہ وزیر کو بھی بادشاہ کے پیچھے روانہ کر دے اور خود عدل و انصاف سے حکومت کرے۔ یہ سوچ کر اُس نے وزیر سے کہا، "ہم نے سُنا ہے کہ تمھیں بھی شکار سے بہت دل چسپی ہے، اگر تم بادشاہ سلامت کے ہمراہ جانا چاہتے ہو تو جا سکتے ہو۔" وزیر یہ سُن کر بہت خوش ہوا اور وہ بادشاہ کے ہمراہ شکار کھیلنے چلا گیا۔

شہزادہ خرم عدل و انصاف سے روز کئی جھگڑے چُکاتا۔ ایک دن وہ دربار میں بیٹھا تھا کہ ایک بڑھیا آئی اور کہنے لگی کہ "بادشاہ سلامت کا اقبال بلند ہو، میں ایک بات عرض کرنا چاہتی ہوں۔"

شہزادے نے اسے اجازت دے دی تو اس نے کہا، "بادشاہ سلامت نے میرے دو گاؤں بلا وجہ چھین لیے تھے، میں بے سہارا بیوہ عورت ہوں۔ میری ایک یتیم لڑکی ہے۔ مجھے وہ گاؤں دلائے جائیں۔" شہزادہ اس بات کو سُن کر بڑھیا کے ساتھ اُس کے گاؤں دلانے کی غرض سے خود روانہ ہو گیا۔ جُوں ہی وہ اُس کے گاؤں پہنچا تو گاؤں والوں نے اس کا استقبال کیا اور پھر

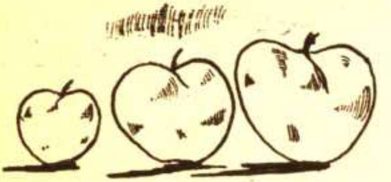
شہزادے کے حکم پر اُنھوں نے وہ گاؤں بڑھیا کو واپس دے دیے۔ بڑھیا نے شہزادے کو دعائیں دیں اور خود اپنی بیٹی کے ساتھ اپنے گاؤں میں چلی گئی۔

جب بادشاہ واپس آیا تو اُس نے دیکھا کہ اُس کی سلطنت آگے سے بہت چمک رہی ہے تو وہ بہت خوش ہوا۔ اُس کی آنکھیں کھل گئیں، اسے احساس ہوا کہ وہ آج تک ظلم کر رہا تھا، اُس نے اسی وقت شہزادے خرم کو بلایا اور کہا،

"تم نے ہماری عدم موجودگی میں جو کام انجام دیے ہیں، ہم اس سے بہت خوش ہیں اور آج سے سلطنت کی ذمہ داری کا بوجھ تمھارے سر پر ڈالتے ہیں۔" یہ کہہ کر بادشاہ نے تاج شہزادے خرم کے سر پر رکھ دیا اور پھر شہزادے نے بادشاہ سلامت کو بڑھیا اور اُس کی لڑکی کے متعلق بتایا۔ بادشاہ بہت خوش ہوا، اُس نے شہزادے کی ذہانت کی بڑی تعریف کی اور بڑھیا اور اُس کی لڑکی کو بُلا کر بڑھیا کی لڑکی نیلوفر کی شادی شہزادہ خرم سے کر دی۔

تین سیب

فریدہ مقصود
لائل پور



ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ کسی ملک میں ایک بادشاہ حکومت کرتا تھا، اس کے گھر کوئی اولاد نہ تھی، بڑی منّتوں اور مُرادوں کے بعد ایک لڑکی پیدا ہوئی اس کا نام اس نے شہزادی زرینہ رکھا۔ اس بادشاہ کا نام سردار تھا، اس لیے رعایا اسے شہزادی زرینہ سردار کہہ کر پکارتی تھی۔ بادشاہ نے شہزادی زرینہ کی تعلیم و تربیت کے لیے بڑے بڑے عالم فاضل مقرر کیے۔ جب شہزادی جوان ہو گئی تو بادشاہ کو اُس کی شادی کی فکر ہوئی۔ شہزادی نے شرط رکھی کہ جو کوئی مجھ سے دَوڑ میں تیز بھاگے گا اور آگے نکل جائے گا میں اُس سے شادی کروں گی۔ اتفاق سے اُسی دن دوسرے ملک کا شہزادہ اس ملک میں شکار کھیلنے کے لیے آیا ہوا تھا۔

جب اُس نے یہ اعلان سُنا تو بہت خوش ہوا۔ اُسے کسی طرح پتہ چل گیا کہ شہزادی کو سنہری چیزیں بہت پسند ہیں۔ اُس نے سونے کے تین سیب بنوائے اور دَوڑ کا اعلان کر دیا۔ بادشاہ، وزیر، درباری اکٹھے ہوئے اور ساری رعایا بھی آئی۔ جب تماشائی اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے تو دوڑ شروع ہوئی۔ جب شہزادی شہزادے سے آگے نکلنے کی کوشش کرتی تو شہزادہ وہ سنہری سیب پھینک دیتا، شہزادی اُسے اُٹھانے کے لیے جھکتی تو وہ آگے نکل جاتا، دوسری دفعہ جب شہزادی آگے نکلنے لگی تو شہزادے نے پھر وہی سیب پھینک دیا۔ جب شہزادی اُسے اُٹھانے کے لیے جھکی تو پہلا سیب اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ اب آخری چکر تھا اور شہزادے کے پاس تیسرا سیب موجود تھا۔ شہزادی ہرنی کی طرح چوکڑیاں بھرتی ہوئی اس سے آگے نکل جانے کی کوشش کر رہی تھی کہ شہزادے نے وہ تیسرا سیب بھی پھینک دیا۔ جب شہزادی نے وہ چمکتی ہوئی چیز دیکھی تو رُک گئی اور سیب کو اُٹھالیا۔ شہزادہ دوڑ جیت چکا تھا۔ بادشاہ نے اُٹھ کر شہزادے کو گلے سے لگالیا۔ جب شہزادی کو گلے سے لگایا تو اُس کے آنسو نکل آئے۔ بادشاہ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اس کے دوسرے دن شہزادہ گلفام اور شہزادی زرینہ کی شادی بڑی دھوم دھام سے منائی گئی اور شہزادہ گلفام بڑے عدل و انصاف سے حکومت کرنے لگا۔

بدی کا انجام

ارشد حسین
دیناج پور



ایک آدمی کے دو بیٹے تھے۔ بڑے بیٹے کا نام کلیم تھا اور چھوٹے کا نسیم۔ کلیم بڑا کاہل تھا۔ اسے باپ جو کام بھی کہتا وہ نسیم سے کراتا۔ اس کے برعکس نسیم انتہائی چست و چالاک لڑکا تھا۔ اُسے باپ جو کام بھی کہتا یہ جھٹ پٹ کر دیتا اور پھر نسیم کا کام بھی خوش اخلاقی

سے کرتا۔

ایک دن وہ اپنے کام میں مصروف رہنے کی وجہ سے کلیم کا کام نہ کر سکا۔ جس کی وجہ سے کلیم نے اُسے بہت مارا، لیکن پھر بھی نیک دل نسیم نے اُسے کچھ نہ کہا، بلکہ اس سے معافی مانگی اور اس کا کام بھی ذرا دیر میں کر دیا، اس پر بھی سخت دل کلیم کا دل نہ پسیجا اور وہ روزانہ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر اسے مارتا رہتا۔

ایک دن اُن کے باپ نے انھیں جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لانے کو کہا اور یہ دونوں رسّی اور کلہاڑی لے کر جنگل کی طرف چل پڑے۔ راستے میں کلیم نے نسیم سے کہا، "تم جتنی لکڑیاں کاٹنا مجھے دے دینا، کیوں کہ میں لکڑیاں نہیں کاٹوں گا، بلکہ کسی درخت کے سائے میں بیٹھ کر آرام کروں گا۔" نسیم نے آہستگی سے نرم لہجے میں کہا، "لیکن ابا جان نے تو ہم دونوں کو الگ الگ لکڑیاں کاٹنے کو کہا تھا۔" اس کا اتنا کہنا تھا کہ کلیم زور سے چلّایا، "کم بخت مجھ سے بحث کرتا ہے۔" اتنا کہہ کر اس نے اسے زمین پر گرا مارا، اتنے میں اس کا باپ۔ جو کسی کام کے لیے گھر سے نکلا تھا اُن کو دیکھ لیا اور آ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور نسیم کو مارنے کی وجہ پوچھی تو خود غرض کلیم نے کہا کہ اس نے مجھے گالی دی۔ اگرچہ اس کا باپ یہ جانتا تھا کہ نسیم اُسے گالی نہیں دے سکتا، کیوں کہ اس کے دل میں کلیم کی بہت عزت اور محبت ہے، پھر بھی اُس نے نسیم کو پیار سے سمجھایا، "اچھے بچّے بھائیوں کو گالی نہیں دیتے۔" انھیں پھر روانہ کر دیا۔ جنگل پہنچ کر کلیم اپنے کہنے کے مطابق ایک پُرانے درخت کے نیچے بیٹھ گیا اور نسیم لکڑیاں کاٹنے لگا۔ اس کے لکڑی کاٹنے کے دَوران یہ کہہ کر "تم بہت کاہل ہو اور لکڑیاں بہت آہستہ آہستہ کاٹ رہے ہو۔" اسے کئی بار مارا بھی۔ اس پر بھی نسیم نے کچھ نہ کہا، بلکہ وہ یہ سمجھا کہ میں سچ مچ لکڑیاں بہت آہستہ کاٹ رہا ہوں، یہ سوچ کر اس کا ہاتھ اور تیز چلنے لگا۔ کچھ دیر بعد اچانک درخت کے نیچے سے کلیم کی چیخ بلند ہوئی اور نسیم گھبرا کر پلٹا تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک کالا ناگ جنگل کی طرف بھاگا جا رہا ہے اور کلیم زمین پر پڑا تڑپ رہا ہے۔ یہ دیکھ کر اس کے منھ سے چیخ نکل گئی "میرا بھیّا"

اس نے دَوڑ کر تڑپتے ہوئے کلیم کو زبردستی اپنے کاندھے پر اُٹھایا اور گاؤں کی طرف دَوڑنے لگا۔ اس کی چیخ و پکار سُن کر کئی آدمی اپنے گھروں سے نکل آئے۔ کلیم کے باپ نے جو اسے اس حالت میں دیکھا تو وہ ایک چیخ مار کر بیہوش ہو گیا۔ گاؤں کے کئی آدمیوں نے جو سانپ کا کاٹا جھاڑنا جانتے تھے، کلیم کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کی، لیکن وہ تقریباً دو گھنٹے تک کرب و تکلیف کی حالت میں رہا، پھر جاں بحق ہو گیا۔ مرتے وقت نسیم کی طرف انتہائی پیار سے دیکھتے ہوئے صرف اتنا کہا "بھیا مجھے معاف کر دینا"۔

کئی دن بعد نسیم کسی کام کی غرض سے جنگل کی طرف گیا تو یکایک اس کی نظر اس کالے ناگ پر پڑی، وہ اسی کی طرف آ رہا تھا۔ جب وہ اس کے قریب پہنچا تو نسیم نے ایک ڈنڈے کی مدد اسے مارنا چاہا، لیکن اس نے کہا، "نسیم تم مجھے مت مارو۔ کلیم کو جو میں نے کاٹا تھا تو اس لیے کہ وہ اس کا انجام تھا۔ تم اسے اچھی طرح جانتے تھے وہ نیکی کا بدلہ بدی سے دیتا تھا اور ایسے لوگوں کا انجام یہی ہوتا ہے اور تم! تمھاری نیکی کا بدلہ یہ ہے"۔ یہ کہہ کر اس نے نسیم کو ایک منکا دیا اور جنگل میں غائب ہو گیا۔

کفایت شعاری

محمد اقبال اثر
لاہور



کرو مل کے بچو کفایت شعاری
کہ عزت بنے گی اسی سے تمھاری
جو بچہ کفایت شعاری کرے گا
وہ دُنیا میں ہرگز نہ بھوکا مرے گا
اسے زندگی کا بنا لو اُصول
کہ پیسے کبھی ہم نہ خرچیں فضول
اگر آج پیسے بچاؤ گے تم!
تو مشکل میں آرام پاؤ گے تم
کفایت کو اپنایا جس نے یہاں پر
اُڑا اُس کا پرچم ہے سارے جہاں پر
بھلوں کو یہ کافی ہے میرا اشارہ
کہ بچت سے بڑھ کر نہیں ہے سہارا

تمہارا خیال ہے



دل چسپ مضامین

ہمدرد نونہال کا ہر صفحہ اور ہر مضمون دل چسپ تھا۔ بلاشبہ ہم رسالے کی خوشنمائی اور خوب صورتی کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ آپ کے اس رسالے نے قلیل عرصے میں جو حیرت انگیز ترقی کی ہے، اس کی مبارک باد دیتا ہوں۔

عبداللہ خاں۔ ٹنڈو آدم

تعلیمی معمّا

اپریل ۱۹۶۵ء کا رسالہ ہمدرد نونہال نظر سے گزرا۔ ٹائٹل کو نظر سے ہٹانے کے لیے دل نہیں چاہتا تھا، کیوں کہ ٹائٹل بہت حسین اور خوب صورت تھا۔ اس پیارے اور خوب صورت رسالے کو دیکھتے ہی دل باغ باغ ہوگیا۔ اس رسالے کے تمام مضامین اپنی اپنی جگہ پر بہت اچھے ہیں۔ یہ رسالہ ہمارے نونہالوں کے معیار کے مطابق ہے۔ یُوں تو ہمدرد نونہال پاکستان کے تمام بچّوں کے رسالوں سے اچھا اور دل چسپ ہوتا ہے۔ اگر آپ اس رسالے میں کوئی تعلیمی معمّا بھی شروع کردیں تو ہمدرد نونہال کو چار چاند لگ جائیں۔ بھائی جان، آپ جو باتیں صحت کے متعلق

رسالے میں چھاپتے ہیں وہ باتیں یقیناً ہمارے لیے بہت ہی مفید ہوتی ہیں۔ آپ آئندہ بھی ایسی باتیں رسالے میں ضرور چھاپا کریں۔

محمد رفیق۔لائل پور

سب رسالوں سے اچھا

رسالہ نونہال ہر مہینے باقاعدگی سے پڑھتی ہوں اور اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ درحقیقت جتنی اس رسالے نے ترقی کی ہے اور کسی رسالے نے نہیں کی۔ قصّے کہانیوں کے علاوہ معلوماتی کہانیاں جو کہ ہماری معلومات میں اضافہ کرتی ہیں، زیادہ تعداد میں ہوتی ہیں اور اس قدر دل چسپ ہوتی ہیں کہ پڑھنے کو بے ساختہ دل چاہتا ہے اور یہ سب آپ کی محنت اور کوشش کا نتیجہ ہے۔ ٹائٹل جتنا خوب صورت اس رسالے کا ہوتا ہے اور کسی رسالے کا نہیں ہوتا۔ اور یہ بات میں فخر سے کہہ سکتی ہوں کہ تمام رسالوں میں اعلا مقام اسی رسالے کو حاصل ہے، جس کے لیے میں آپ کو مبارک باد دیتی ہوں اور اس کی ترقی کے لیے دعا کرتی ہوں۔

عذرا برلاس۔کراچی

انعامی مقابلہ

اپریل کا رسالہ دیکھتے ہی بلیوں نے خوش آمدید کہی۔ ہم نے بھی ان کا شکریہ ادا کیا۔ بس پھر کیا تھا، انھوں نے ہمیں سارے حالات بتا دیے کہ وہ کیا ہیں۔ یہ رسالہ اب خدا کے فضل و کرم سے دن رات ترقی کر رہا ہے۔ اس دفعہ کہانیوں میں "ہریل توتا"، "ایک اچھی لڑکا" اور "بٹوہ کالا خوب نکالا"۔ نظموں میں "خوابوں کے محل"، "علم" اور "ٹیلیفون" بہت ہی پسند آئے۔ بھائی جان، آپ کوئی انعامی مقابلہ شروع کریں۔ یہ کارٹون دارٹون کا سلسلہ بند کریں اور علاوہ ازیں نونہال ادیب کے صفحات کو زیادہ بڑھادیں۔

غلام حسین ہاشمی۔پنڈی گھیپ

ادبی مشغلہ

مارچ ۱۹۶۵ء کے رسالے میں "اخبار نونہال"، "پال بنیان کی جناتی گھڑی"، "اغوا" "تار برقی کے موجد" پسند آئے۔ اپریل ۱۹۶۵ء کے ہمدرد نونہال کا ٹائٹل بہت پسند آیا۔ اسی طرح "ہریل توتا"، "شیر ببر جو افریقی جنگل کا بادشاہ تھا"، "افریقہ کے جنگل میں چھے دن" اور "بٹوہ کالا خوب نکالا" بہت ہی پسند آئے۔ اس میں ایک چیز کی زبردست کمی ہے وہ یہ کہ آپ کوئی ادبی

مشغلہ شروع کردیں جس میں نونہالانِ پاک بھی خوشی سے حصّہ لیں اور آپ کا بھی فائدہ ہو۔ میری طرف سے جناب حکیم سعید صاحب اور تمام اچھے لکھنے والے حضرات کو مبارک باد۔

سید گل حسین۔ شاہ محمد ہزارہ

میرا مشورہ ہے

ہمدرد نونہال اپریل کا رسالہ ملا۔ پڑھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔ مضامین میں مندرجہ ذیل پسند ہیں۔ جاگو جگاؤ، بٹوہ کالا خوب نکالا، فرض، تاریک براعظم کے جانور، چاند کی مَن چلی کرن اور افریقہ میں پچھلے دن بہت پسند آئے۔ میرا مشورہ ہے کہ آپ "تمھارا خیال ہے" کا نام بدل کر یہ نام رکھ دیجیے "ہمدرد نونہالوں کے خیالات" دوسرے نونہال میرے اس تجویز کردہ نام کی تائید کریں گے۔

کلیم اشرف۔ لاڑکانہ

واقعی ہمدرد ہے

اس دفعہ کا ہمدرد نونہال پڑھا۔ پڑھنے کے بعد بے ساختہ منھ سے نکل پڑا کہ یہ واقعی ہمدرد ہے۔ نونہال ادیب کا سلسلہ بہت اچھا ہے۔ اسے جاری رکھیں۔ ویسے اب تو ہمدرد نونہال نے اتنی ترقی کرلی ہے کہ اس کی تعریف بیان نہیں کرسکتا۔ یہ سب آپ کی محنت کا نتیجہ ہے۔ اگر یہی رفتار جاری رہی تو ایک دن ایسا آئے گا کہ ہمدرد نونہال ترقی کرتے کرتے تمام بچّوں کے پرچوں پر بادل بن کر چھا جائے گا۔ بس میری دلی دُعا ہے کہ اس رسالے کو خدا دن دونی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے۔

مفتی بشیر احمد۔ پشاور

بہت خوب

اپنا پیارا رسالہ ہمدرد نونہال پڑھا۔ بہت پسند آیا۔ ٹائٹل بڑا بہترین تھا۔ آرٹسٹ صاحب کو میری جانب سے مبارک باد پہنچادیں۔ اپریل کا پرچہ اپنی مثال آپ تھا۔ یہ سب آپ کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ کہانیوں میں "بلّی، بھوت اور اُلو"، "ہریل توتا"، "ایک اپنی لڑکا" اور "بٹوہ کالا خوب نکالا" بہت پسند آئے۔ ڈرامہ "فرض" بھی بہترین تھا، نظموں میں "خوابوں کے محل" بہت پسند آئی۔

انجم توحید صدیقی۔ لاڑکانہ

ترقی کی راہ پر

اپریل کا رسالہ دیکھ کر طبیعت خوش

ہو گئی کہ ہمدرد نونہال اپنی پوری آب و تاب سے چمک رہا ہے ۔ خاصکر اس دفعہ آپ نے رسالے کو چار چاند لگا دیے۔ ٹائٹل اتنا پیارا اور دل کش تھا کہ اس سے نظریں ہٹانے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ نہ جانے آپ ٹائٹل میں کون سا جادو بھر دیتے ہیں۔ اگر یہ رسالہ اسی طرح دن دُگنی اور رات چوگنی ترقی کرتا رہا تو وہ دن دُور نہیں جب یہ تمام پاکستان بھر میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ ہمدرد نونہال سے اس قدر دل چسپی اور محبت ہو گئی ہے کہ ہر ماہ کے ہمدرد نونہال کا انتظار بڑی بے چینی سے کرتا ہوں۔ ہمدرد نونہال واقعی قابلِ تعریف ہے۔ اس دفعہ مندرجہ ذیل مضامین بہت ہی پسند آئے۔

"بلّی کی کہانی اس کی اپنی زبانی"، "تاریک براعظم کے جانور"، افریقہ میں چھٹے دن"، فرض (ڈرامہ)" "سو بیٹوں کا باپ"۔

سعید زماں خاں، سیالکوٹ

باغ باغ ہو گیا

مئی ۱۹۶۵ء کا شمارہ میری نظر سے گزرا۔ شمارہ پڑھ کر طبیعت باغ باغ ہو گئی سب مضامین قابلِ تعریف ہیں۔ اس سے پہلے میں نے ہمدرد نونہال کا مطالعہ نہیں کیا تھا، لیکن میرے دوست شمشیر کی نوازش سے مجھ کو پڑھنے کو ملا۔ رسالے کو ہاتھ میں لیتے ہی چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ اب میں نے اس کا باقاعدہ مطالعہ کرنے کو سوچ لیا ہے اور اُمید ہے کہ اور بھی اچھے اچھے مضامین شائع ہوتے رہیں گے۔ ہماری بھی یہی دعا ہے کہ خدا اس رسالے کی ترقی میں دن دوگنی رات چوگنی ترقی کرے۔

عبدالقادر۔ ڈھاکہ

موسم کے مطابق

آپ کا رسالہ ماہ مارچ دیکھا پسند آیا، لیکن اس دفعہ آپ نے ٹائٹل بالکل ایسا دیا جس کو کوئی نیا نونہال دیکھے تو رسالہ پسند نہ کرے۔ آپ ٹائٹل موسم کی تبدیلی کے لحاظ سے دیں۔ مثلاً موسم برسات میں برسات کا خوب صورت سین۔ موسم بہار میں پھولوں کا خوب صورت پارک، گلدستہ وغیرہ۔ جناب سلیم رضا صاحب کے خیال سے متفق ہوں۔ آپ بنگالی کا سبق شروع کر دیں۔ رسالے کے تقریباً تمام مضامین بہت پسند آئے۔ رسالہ عمدہ چھپوانے کا نہایت شکریہ۔

محمود اقبال۔ کراچی

حلقۂ دوستی

عبدالرزاق حبیب - کراچی

عمر : ۱۶ سال   تعلیم : نہم

دل چسپیاں : مضمون نویسی ، افسانہ نویسی

پتہ : غفار یوسف بلڈنگ ۱۴/۴ پرنس اسٹریٹ کراچی

محمد جاوید - پشاور

عمر : ۱۲ سال   تعلیم : ہشتم

دل چسپیاں : ہمدرد نونہال پڑھنا ، تقاریر

پتہ : جاوید برادرز - پیپل منڈی - پشاور

محمد صدیق طاہر - راولپنڈی

عمر : ۱۷ سال   تعلیم : فرسٹ ائر

دل چسپیاں : بچوں کے رسائل کا مطالعہ -

پتہ : معرفت گلاب خاں صاحب - مین بازار ٹیکسلا ضلع راولپنڈی

حافظ غلام مصطفےٰ صدیقی - لاہور

عمر : ۱۸ سال   تعلیم : فرسٹ ائر

دل چسپیاں : قلمی دوستی ، فوٹو گرافی ، عام مطالعہ

پتہ : شاہ عالمی گیٹ - پاپڑ منڈی - مکان نمبر $\frac{۲۴۲۵}{D}$ لاہور

سمیع الدین اکبر آبادی - حیدر آباد

عمر : ۱۸ سال   تعلیم : ششم

دل چسپیاں : مضمون نگاری ، قلمی دوستی

پتہ : مکان D-۶۳۱-۵۵ ، حر لائن - بھائی خاں کی چاڑی - حیدر آباد

محمد شوکت - لائل پور

عمر : ۱۶ سال   تعلیم : دہم

دل چسپیاں : بہن بھائیوں سے قلمی دوستی -

پتہ : مکان ۱/۱ طارق آباد - لائل پور

شمس الدین ساقی - ملتان

عمر : ۱۵ سال   تعلیم : مڈل

دل چسپیاں : نونہال پڑھنا

پتہ : سبزی منڈی - مخدوم پور - ضلع ملتان

خالد قدوس۔ جہلم
عمر : ۱۴ سال تعلیم : نہم
دل چسپیاں : کرکٹ کھیلنا
پتہ : معرفت عبدالقدوس ملٹری کالج۔ جہلم

محمد یعقوب تبسم۔ تلہار
عمر : ۱۸ سال تعلیم : دہم
دل چسپیاں : کرکٹ کھیلنا، قلمی دوستی
پتہ : ڈی۔سی ہائی اسکول۔ تلہار

رضیہ سلطانہ۔ جیکب آباد
عمر : ۱۶ سال تعلیم : دہم
دل چسپیاں : قلمی دوستی، ہمدرد نونہال
پتہ : معرفت غلام قادر سومرہ محلہ بردہی
نزد پرانا سول شفاخانہ۔ جیکب آباد

الطاف حسین ناصر۔ ڈیرہ غازیخاں
عمر : ۱۵ سال تعلیم : ہشتم
دل چسپیاں : رسالے پڑھنا، قلمی دوستی
پتہ : معرفت بشیر احمد قانون گو زرعی اصلاح
محلہ اسلام آباد۔ نزد چورٹہ ڈیرہ غازیخاں

زبیر احمد۔ ملتان
عمر : ۱۱ سال تعلیم : ششم
دل چسپیاں : بچوں کے رسالے پڑھنا
پتہ : معرفت برادرز میڈیکل سروس حرم گیٹ
ملتان

زاہد حفیظ خرم۔ لاہور
عمر : ۱۳ سال تعلیم : نہم
دل چسپیاں : قلمی دوستی، ہمدرد نونہال پڑھنا
پتہ : ۱۶ سیلون بلڈنگ۔ لاہور

محمد جاوید اقبال۔ بھاول نگر
عمر : ۹ سال تعلیم : پنجم
دل چسپیاں : تعلیم حاصل کرنا۔ قلمی دوستی
پتہ : معرفت اقبال اسلم صاحب۔ بھاول نگر

محبوب عالم بھٹہ۔ ملتان
عمر : ۹ سال تعلیم : پنجم
دل چسپیاں : قلمی دوستی، کہانیاں پڑھنا۔
پتہ : کالونی ہائی اسکول اسماعیل آباد
ضلع ملتان

سید ثاقب حسین۔ منٹگمری
عمر : ۱۰ سال تعلیم : پنجم
دل چسپیاں : قلمی دوستی کرنا۔
پتہ : فیض پور۔ ڈاک خانہ بائیں گنج
تحصیل پاک پٹن۔ ضلع منٹگمری

مختار احمد برکاتی۔ کراچی
عمر : ۱۳ سال تعلیم : ہشتم
دل چسپیاں : مطالعہ۔ ٹکٹ جمع کرنا۔
پتہ A ۲۹۸/ ۴ لیاقت آباد۔ کراچی ۱۹

زرین سلطانہ۔کراچی
عمر : ۱۲ سال تعلیم : ششم
دل چسپیاں : ہمدرد نونہال پڑھنا
پتہ : ۵۴/F رضویہ کالونی۔ ناظم آباد۔کراچی

رفیع القدر۔حیدرآباد
عمر : ۱۵ سال تعلیم : دہم
دل چسپیاں : ہاکی کھیلنا، میچ دیکھنا
پتہ : کوارٹر نمبر ۹/B بیراج کالونی۔حیدرآباد

تسلیم الٰہی زلفی۔کراچی
عمر ۱۴ سال تعلیم : نہم
دل چسپیاں : کہانیاں، نظمیں لکھنا، قلمی دوستی
پتہ : ۱۳۲/H عقب جیکب لائنز۔کراچی ۳

ہما شاہ۔حیدرآباد
عمر : ۱۱ سال تعلیم : ہفتم
دل چسپیاں : بہنوں سے قلمی دوستی
پتہ : معرفت ہما انور علی شاہ کوارٹر نمبر ۸۳/D وحدت کالونی

ابوالمحاسن۔حیدرآباد سندھ
عمر : ۱۳ سال تعلیم : نہم
دل چسپیاں : قلمی دوستی اور اداکاری
پتہ : ۲۶۲/C بلاک D یونٹ ۶
لطیف آباد۔حیدرآباد سندھ

ظفر علی۔لائل پور
عمر : ۱۶ سال تعلیم : نہم
دل چسپیاں : کرکٹ کھیلنا، قلمی دوستی
پتہ : ایم۔سی۔ہائی اسکول۔کوتوال روڈ
لائل پور

مرزا حفیظ احمد۔سکھر
عمر : ۱۵ سال تعلیم : ہفتم
دل چسپیاں : ٹکٹ جمع کرنا
پتہ : فضل آٹوموبائلز۔اسٹیشن روڈ۔سکھر

محمد یعقوب۔حیدرآباد
عمر : ۱۴ سال تعلیم : نہم
دل چسپیاں : ٹکٹ جمع کرنا، قلمی دوستی
پتہ : معرفت حاجی ستار حاجی یوسف
مول چند بلڈنگ۔لجپت روڈ۔حیدرآباد

عبدالحمید شاہد۔گوجرہ
عمر : ۱۵ سال تعلیم : نہم
دل چسپیاں : نونہال پڑھنا۔قلمی دوستی کرنا
پتہ : اسلامیہ ہائی اسکول۔گوجرہ

رضوان حسرت۔پشاور
عمر : ۱۷ سال تعلیم : ایف اے
دل چسپیاں : شاعری، افسانہ نویسی
پتہ : ۱۱۵۶ محلہ تسبیح گراں۔پشاور

محمد اسلم ارشد تبسم۔ڈیرہ اسماعیل خاں
عمر : ۱۵ سال تعلیم : نہم
دل چسپیاں : ہمدرد نونہال پڑھنا۔قلمی دوستی

پتہ : چوک یادگار حسینی اللہ وسایا ٹیلر ماسٹر
ڈیرہ اسماعیل خاں

اسرار احمد-میرپور خاص

عمر : ۱۵ سال تعلیم : دہم
دل چسپیاں : ٹکٹیں جمع کرنا، قلمی دوستی
پتہ : گورنمنٹ ہائی اسکول-میرپور خاص

فقیر حسین - پشاور

عمر : ۱۷ سال تعلیم : دہم
دل چسپیاں : افسانہ نویسی-فٹ بال
پتہ : دکان نمبر ۲۳۳۷ اندرون ہشت نگری
پشاور

ایس جاوید زیدی-کراچی

عمر : ۱۳ سال تعلیم : ہفتم
دل چسپیاں : صبح شام ورزش کرنا
پتہ : کوارٹر B/۳۸۶ بلاک ۱۰ لیاقت آباد کراچی

احمد نعمان - کراچی

عمر : ۱۰ سال تعلیم : ششم
دل چسپیاں : مطالعہ کرنا، ٹکٹ جمع کرنا
پتہ : B ۴۵/۱۵ ناظم آباد - کراچی

نثار سرور - کھارہ

عمر : ۱۷ سال تعلیم : ایف ایس سی
دل چسپیاں : پڑھائی، نماز، فوٹو گرافی-
پتہ : مکان نمبر ۲۵۸۵ - آفیشل کالونی
ٹیک موج دریا-ملتان

جے رحمٰن - کراچی

عمر : ۱۷ سال تعلیم : انٹرمیڈیٹ
دل چسپیاں : قلمی دوستی - کرکٹ کھیلنا
پتہ : معرفت ۹۱ موتن بلڈنگ گراؤنڈ فلور
بندر روڈ-کراچی

ایس-ایم سمیع-کراچی

عمر : ۱۵ سال تعلیم : دہم
دل چسپیاں : رسالوں کا مطالعہ
پتہ : کورنگی نمبر ۲ کوارٹر T/۱۴۵
کراچی ۳۱

فارم حلقۂ دوستی

نام : ------------ عمر ------------ تعلیم ------------
دل چسپیاں : --
پتہ : --

اِن الفاظ کے معنی کیا ہیں؟

اتالیق : اُستاد، ادب سکھانے والا
اُتّر : شمال
اُٹھائی گیرا: اُچکّا
اُجرت : مزدوری
اصلاح : درستی، سدھارنا
افق : آسمان کا کنارا جہاں زمین اور آسمان ملے ہوئے نظر آتے ہیں۔
انوکھی : عجیب و غریب، نرالی
آنکس : ہاتھی کو ہانکنے کا آلہ، جو ہاتھی بان استعمال کرتا ہے۔
بنجر : وہ زمین جس میں کچھ پیدا نہ ہو
بہروپ : مختلف قسم کا بھیس
بھید : دل کی بات، چھپی ہوئی بات
بیساکھی : وہ لکڑی جس سے معذور لوگ سہارا لے کر چلتے ہیں۔
پچھم : مغرب
پورب : مشرق
پھننگ : درخت کی چوٹی
پیش کش : نذر، تحفہ
تعمیل : حکم بجانا، حکم پورا کرنا
جھٹ پٹا: صبح یا شام کا وقت جس وقت اندھیرا ہو۔
جعل ساز: دھوکے باز
خراج : زمین کا ٹیکس
خطّہ : زمین کا کوئی حصّہ
درکار: ضرورت، خواہش
دکّھن : جنوب
دھجّی : کاغذ یا کپڑے کی لمبی پٹی یا کترن
ڈیوڑھی : مکان کا وہ حصّہ جو دروازے سے ملا ہو۔ دہلیز
راہ گیر: مسافر، راستے پر جانے والا
شعبدہ : نظر بندی۔ دھوکا
شعبدے باز : وہ بازی گر جو تعجب انگیز کرتب دکھائے۔
طفیلی : بے بلائے کسی کے ساتھ دعوت میں چلا جانا۔
ظلمت: اندھیرا، تاریکی
عاجزی: خاکساری
عتاب: غصّہ، ناراضی
کانڑا : کانا

حکیم حافظ محمد سعید ایڈیٹر، پرنٹر پبلشر نے زین پیکجنگ انڈسٹریز کراچی میں چھپوا کر ادارہ مطبوعات ہمدرد ناظم آباد کراچی سے شائع کیا



برسات

مشرقی ملکوں میں برسات کا موسم بڑا سہانا ہوتا ہے ۔ساون کا چھینٹا پڑتے ہی رُوح تازہ ہو جاتی ہے ۔شاخوں میں نئی کونپلیں پھوٹتی ہیں اور دلوں میں نئی امنگیں پیدا ہوتی ہیں ۔

لیکن بسا اوقات بیماریاں اس طرح گھیرتی ہیں کہ موسم کا سارا لطف زائل ہو جاتا ہے ۔ اس ہری بھری رُت میں مرجھائے ہوئے چہرے اور اُداس آنکھیں کیسا حسرت ناک منظر پیش کرتی ہیں ۔تاہم اگر لوگ اپنے آپ کو موسم کے مطابق ڈھال سکیں تو زندگی کیسی خوشگوار ہو جائے ۔

برسات میں گھروں کے نزدیک اور آبادی کے آس پاس کوئی ایسی چیز نہ ڈالیے جس کے، بارش میں بھیگنے اور دھوپ لگنے سے بخارات اٹھ کر صحت پر بُرا اثر ڈال سکیں ۔کسی جگہ پانی جمع نہ ہونے دیا جائے کہ مچھر پیدا ہو سکیں ۔پانی جمع ہو جانے کی صورت میں اس پر مٹی کا تیل چھڑک دینا چاہیے ۔ غذا ایسی نہ کھائیے کہ ہاضمہ خراب ہو جائے ۔پانی جوش دے کر اور صاف کر کے پیجیے ۔
نیز اس سلسلے میں ایک مفید تدبیر **صافی** کا استعمال ہے جو آپ کو اس موسم کی عام تکالیف سے محفوظ رکھے گا ۔

ہمدرد کا نصب العین انسانوں کی صحیح طریقۂ زندگی کی طرف رہنمائی کرنا ہے ۔

ہمدرد

رجسٹرڈ ایس نمبر ۱۹۰۳
جون ۱۹۶۵ء
ہمدرد

نونہال

بارھویں جلد
چھٹا شمارہ

اس رسالے میں کیا ہے؟

قیمت: ایک رسالہ ۷۵ پیسے ——— سالانہ آٹھ رُپے